جلد ۶۷ اگست ۱۹۶۷ء عدد

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ: سات روپے قیمت فی پرچہ: ۷۵ پیسے

اذکارِ مسنونہ

تالیف
علامہ حافظ ابن قیم
ترجمہ و حواشی
مولانا خلیل احمد حامدی

- دعا عبادت کا مغز ہے اور قرب الٰہی کا ایک ذریعہ لیکن کون سی دعا کیسے اور کس وقت مانگی جائے ۔
- ہمیں ان سب کی تعلیم خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے آپ سے زیادہ بہتر نہیں اور نہیں جانتا کہ کن الفاظ کا استعمال بہتر تھا ۔
- دعاؤں میں مستحب اور مسنون اذکار اور دعاؤں کا مجموعہ علامہ حافظ ابن قیمؒ نے مرتب فرمایا ہے جس کا ترجمہ و ترتیب نئے اور ترجمہ و حواشی سے مزین کر کے مولانا خلیل احمد حامدی نے پیش کیا ہے ۔
- اس کتاب میں آپ کو اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے سفر و حضر مسجد و بازار مسرت و غم خلوت و جلوت تمام اوقات کے لیے مسنون دعائیں ملیں گی ۔
- صحت الفاظ و اعراب کا خاص اہتمام کیا گیا ہے ۔
- ہر مسلمان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔ خود پڑھیے اور اپنے احباب و اعزہ اور بال بچوں کو پڑھائیے اور یاد کرائیے ۔

عمدہ کتابت و طباعت

قیمت اعلیٰ ...

ستمبر ۔ ۔ ۲

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ
شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۷	اگست ۱۹۶۷ء	عدد ۶

اشارات	عبدالحمید صدیقی	۲
تفہیم القرآن:		
الواقعہ	ابو الاعلیٰ مودودی	۱۷
مقالات:		
شام کی حزب البعث	خلیل حامدی	۳۶
اسلامی قانونِ تعزیرات	عبدالعزیز عامر - ترجمہ: معروف شاہ شیرازی	۵۲
رسائل و مسائل		
مسائلِ عشر پر مزید بحث	ملک غلام علی صاحب	۵۷

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
ات روپے	۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ، لاہور	۷۵ پیسے

نذیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

عرب ممالک کی اسرائیل کے ہاتھوں شکست اور رسوائی کی جو تفصیلات ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں شائع ہوئی ہیں اُن کے پسِ پردہ جھانکنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ ہُوا ہے اُن میں سے کوئی بات بھی انہونی اور غیر متوقع نہ تھی۔ اس کے پیچھے وہ ساری تاریخی قوتیں کام کر رہی تھیں جو اس نوعیت کے حادثات کو جنم دیتی ہیں۔

قوموں کی زندگی میں دو قسم کے اسباب کی بنا پر تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ ایک وقتی اسباب جنہیں صحیح معنوں میں سطحی اسباب کہنا چاہیے۔ یہ اسباب قومی زندگی کی جوئے رواں کو زیر و زبر نہیں کرتے بلکہ اُس کی سطح پر معمولی سی جنبش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس ہلچل سے زندگی میں کوئی فرق نہیں آتا اور جلد ہی حالات معمول پر آجاتے ہیں۔ دوسرے اسباب بڑے ٹھوس، گہرے اور انقلاب انگیز ہوتے ہیں اور وہ قومی زندگی کے پُورے دھارے کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ سطح بین لوگ شرق اوسط کے اس حادثہ کو محض چند قوموں کی سازش کا نتیجہ سمجھتے ہوئے اُن کے خلاف بس دل کی بھڑاس نکال کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ سطح سے نیچے اُتر کر اُس آتش فشاں کا جائزہ لیتے ہیں جس کی گہرائیوں سے یہ لاوا پھُوٹا ہے وہ کبھی اس بات کا یقین نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ محض ایک وقتی ہنگامے کی حیثیت رکھتا ہے اور بعض اتفاقی اسباب ہی نے اسے جنم دیا ہے۔

قوموں کے عروج و زوال یا دوسرے لفظوں میں اُن کی حیات و ممات کے لیے فلسفۂ تاریخ کے ماہرین نے جو اصول بیان کیے ہیں اُن میں سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ کسی نصب العین سے حقیقی اور سچی محبت اور اس کے حصول کے لیے دل میں گہری لگن قوموں کو کامیابی اور کامرانی کی راہ پر لگاتی ہے۔ جس طرح ایک فردِ رُوح کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا بالکل اسی طرح ایک قوم مقصد کے عشق کے بغیر دنیا

میں کبھی پنپ نہیں سکتی۔ درحقیقت مقصد ہی کسی قوم کی حیات ہے اور بے مقصدی موت۔ مقصد کی محبت کسی قوم کے منتشر اجزا کو ایک دوسرے سے جوڑ کر اُسے قوت و توانائی بخشتی ہے۔ اُسے اپنی صلاحیتوں اور اپنے وسائل کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کا ولولہ عطا کرتی ہے۔ نصب العین کا عشق اُسے ہر قسم کے مفادات سے بے نیاز کر کے اس کے افراد میں ایثار اور قربانی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ جس فرد یا قوم کو جتنا کوئی نصب العین زیادہ عزیز ہوگا اُسی نسبت سے اُس کے دل میں دوسرے مفادات بے وزن ہوں گے۔ محبت اور ایثار دونوں لازم ملزوم ہیں۔ مقصدِ حیات سے گہری وابستگی کے بغیر کسی قوم کے اندر نہ تو اتفاق و اتحاد پیدا ہو سکتا ہے، نہ اُس کے اندر جذبۂ ایثار اُبھرتا ہے اور نہ زندگی کی حرکت و حرارت پیدا ہوتی ہے۔

جس چیز کو فلسفۂ تاریخ مقصد سے عشق کا نام دیتا ہے اُسے مذہب ایمان سے تعبیر کرتا ہے۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ کسی حقیقت کی تصدیق کر کے اس کا فرمانبردار ہو جانا۔ اس کے متعلق فلسفہ اور نفسیات کے ماہرین نے کہا ہے کہ یہ ایک مثبت احساس ہے جس کے زیر اثر نہ صرف انسان خود حقیقت کا اعتراف کرتا ہے بلکہ اُسے دنیا کی سب سے بڑی سچائی سمجھ کر اُسے پوری قوت کے ساتھ پھیلانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی فرد یا قوم نے جس چیز کو حقیقت سمجھا ہے وہ فی الواقع حقیقت ہے یا نہیں، ایمان و اعتقاد اور یقین و اذعان بجائے خود ایک بہت بڑی قوت ہے جسے کوئی فرد یا قوم حاصل کرلے تو کامیابیاں اور کامرانیاں اُس کے قدم چومتی ہیں۔

جب ہم قومی زندگی کے اس بنیادی اصول کی روشنی میں عرب ممالک کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ سوال بار بار اُبھر کر آتا ہے کہ کیا اس قوم کا کوئی ایسا کعبہ مقصود بھی تھا جس سے اسے محبت ہو؟ اسلام جو ان ممالک کے رہنے والوں کی قوت و طاقت کا واحد سرچشمہ تھا، اُس کی محبت سے اُن کے دل خالی ہو رہے تھے اور اُس کی جگہ مغربی الحاد، اخلاقی اباحیت، مغربی تہذیب اور اشتراکیت کو فروغ نصیب ہو رہا تھا۔ اس تلخ حقیقت کو بیان کرتے ہوئے انتہائی دکھ ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کی اس بھیڑ میں کوئی امتیازی وصف ایسا نہ تھا جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا کہ یہ ایک مخصوص اور

متعین مقصد کے حصول کے لیے دنیا میں زندہ ہے۔ اس کے افکار و نظریات مغرب کے ملحدانہ خیالات کا پرتو تھے۔ اس کی معیشت و معاشرت مغرب کی بھونڈی نقالی تھی۔ اس کے خوب و ناخوب کے پیمانے، اس کی اخلاقی اور روحانی قدریں مغرب سے مانگ مانگ کر لائی جا رہی تھیں۔ اس قوم کا حال اُس بدنصیب قافلے کا سا ہو رہا تھا جس کے افراد منزل کھو جانے کی وجہ سے منتشر ہو چکے ہوں اور بھیڑیئے ان میں سے ایک ایک پر حملہ آور ہو کر انہیں نگل جانے کی فکر میں ہوں۔ کبھی سرمایہ داری کے بھیڑیئے آتے اور ان پر جھپٹ کر ان میں سے اچھی خاصی تعداد کو اٹھا کر لے جاتے اور کبھی اشتراکیت کے جنگل سے خونخوار درندوں کے غول کے غول آتے اور ان پر اپنا تسلط قائم کر لیتے۔ یہ قوم جسے کبھی وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل پر ناز تھا، جسے اپنے بنیانِ مرصوص ہونے پر فخر ہوا کرتا تھا، جس کے افراد کے مابین باہمی محبت اور مودت کی تصدیق خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کی تھی، شدید انتشار کی شکار ہو گئی۔ نصب العین کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی یہ قوم اپنا راستہ بھولی، اس کے حوصلے پست ہوئے، اس کے عزائم میں اضمحلال پیدا ہوا اور اس کی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ وہ بھلائیاں جن کے فروغ کے لیے باری تعالیٰ نے اس امت کو مبعوث فرمایا تھا وہ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں اور اُن کی جگہ وہ برائیاں ابھرنے لگیں جنہیں مٹانے کی ذمہ داری براہِ راست اس پر ڈالی گئی تھی۔ اب اس کی ساری توجہ صرف ایک بات پر مرکوز ہو گئی کہ کسی طرح اُس کے افراد زندہ رہ سکیں۔

جب کسی قوم کی روح فنا ہو جائے تو اُس کے افراد لاشے بن جاتے ہیں جن کے خون اور گوشت سے وہ ساری قومیں لذت اندوز ہوتی ہیں جنہیں انسانی لہو کی چاٹ لگی ہوئی ہو۔ ان قوموں نے مسلمانوں کو برباد کرنے کے لیے ہر وہ ذلیل سے ذلیل حربہ استعمال کیا جو استعمار عام طور پر کرتا ہے۔ انہیں معاشی اعتبار سے برباد کیا، ان کی معاشرت تباہ کی، انہیں مختلف نوعیتوں کی سیاسی جکڑ بندیوں میں جکڑا۔ یہ بربادیاں بھی اپنی جگہ کچھ کم نہ تھیں مگر مغربی اقوام کو صدیوں کے تجربات کے بعد اس بات کا پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ اس قوم کو روٹی سے محروم کر لینا یا اس سے تیر و تفنگ کا چھین لینا اسے نیست و نابود نہیں کر سکتا۔ یہ نقصانات اس کے لیے وقتی محرومیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسے اگر اس دنیا سے بحیثیت ایک ملت مٹانا ہے تو اس کی

صرف ایک ہی صورت ہے کہ اسے قوت و طاقت کے اُس اتھاہ خزانے سے یکسر ناآشنا کر دیا جائے جسے یہ ایمان کے نام سے موسوم کرتی ہے اور اس کی جگہ اس کے دل میں ان عصبیتوں کو اُبھارا جائے جو اسے جاہلیت کے طور طریقوں کی پابند بنا دیں۔

مغرب کے یہ ناپاک عزائم پورے ہوئے اور عرب ممالک دینِ حق سے مُنہ موڑ کر ضلالت و گمراہی کی اُن راہوں پر چل نکلے جن پر یورپ شیطان کی پیروی میں برسوں سے چل رہا تھا اور جس کے خوفناک نتائج وہ کافی حد تک دیکھ چکا ہے۔ اہلِ یورپ نے صنعتی انقلاب کے وقت قوم کو معبود بنا کر اس کی پرستش شروع کی، اور دوسری قوموں کے خلاف شدید جذبۂ نفرت و حقارت پیدا کیا مگر پہلی اور دوسری جنگِ عظیم نے اُس پر یہ حقیقت پوری طرح ثابت کر دی کہ اس دَور میں خواہ دوسروں کے خلاف تعصب پھیلانے کے لیے کتنا ہی زور صرف کیا جائے مگر کسی قوم کے لیے جغرافیائی حدود کے اندر مقید رہنا ممکن نہیں۔ حمل و نقل کے جدید ذرائع کی وجہ سے دنیا کے دور دراز گوشے سمٹ کر ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے ہیں۔ چنانچہ اہلِ یورپ نے اپنی تنظیم نو ملکی حدود کی اساس پر کرنے کے بجائے نظریاتی بنیادوں پر شروع کر دی۔ امریکہ اور برطانیہ ایک مقصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے ہم رکاب ہیں۔ اور نیٹو مفادات کا اشتراک اتنی بڑی قوت بن گیا ہے کہ اس نے بظاہر متصادم تصورات رکھنے والی قوموں کو ایک سلک میں منسلک کر دیا ہے۔ روس اور امریکہ کے درمیان آج جو یگانگت ہے وہ امریکہ اور فرانس کے مابین نظریاتی ہم آہنگی کے باوجود نظر نہیں آتی۔

مغرب نے اپنے ہاں تو اشتراکِ عمل کے لیے وسیع تر بنیادوں کو تلاش کیا مگر مسلمانوں کے کانوں میں شیطان کی یہ آواز پھونک دی کہ عرب عربوں کے لیے ہے، ترکی ترکوں کے لیے، ایران ایرانیوں اور افغانستان افغانیوں کے لیے۔ پھر یہ محدود قومیتیں مزید چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئیں۔ آج عرب قومیت کا صور خواہ کتنے ہی زور سے پھونکا جا رہا ہو مگر سعودی، مصری، یمنی، شامی، اُردنی، عراقی، تونسی، الجزائری، مراکشی، وغیرہ بہت سی قومیتوں نے اس نا اتفاقی وحدت کو نہ صرف پارہ پارہ کر دیا ہے بلکہ ان کے درمیان مفادات کی کشمکش

اتنی شدید ہے کہ اسرائیل کا خطرۂ عظیم بھی ان کو جمع کرنے سے قاصر ہے۔ بارہا ان کے درمیان خونریزیاں ہو چکی ہیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے وہ سب کچھ کیا ہے جو باہر کا کوئی دشمن کر سکتا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بدنام اور ذلیل وخوار کرنے کے لیے پریس اور ریڈیو سے وہ گالیاں دی ہیں جو شاید کوئی بیرونی دشمن بھی نہ دیتا۔ حتیٰ کہ دنیا نے یہ شرمناک منظر بھی دیکھا کہ مراکش اور الجزائر کی جنگ میں دشمنِ اسلام ہیلاسیلاسی مصالحت کرانے کے لیے آیا۔ پروردگارِ عالم نے اپنے بندوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے کے لیے انہیں دین کی رسی تھامنے کی ہدایت کی تھی مگر انہوں نے باری تعالیٰ کی اس رحمت کو ٹھکرا کر رنگ، نسل، وطن کا طوق گلے میں ڈال کر اپنے آپ کو ایک دوسرے سے ممیّز اور ممتاز کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے لفظوں میں مغرب جس لعنت کے تباہ کن اثرات دیکھ کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا مسلمانوں نے اسی لعنت کو خود آگے بڑھ کر اپنے اوپر مسلط کر لیا۔ اس قوم سے زیادہ بدنصیب قوم دنیا میں کونسی ہو سکتی ہے جسے اللہ تعالیٰ خاک وخون جیسے مادی رشتوں سے بے نیاز کر کے اس کی تعمیر کے لیے خالص روحانی اقدار عطا فرمائے لیکن وہ اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں کو لات مار کر رنگ، نسل، وطن جیسے اتفاقی حادثات کو اپنی قومیت کی اساس بنانے پر مصر ہو۔

تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ نقالی خواہ افکار ونظریات کی ہو یا افعال واعمال کی اس میں کبھی تخلیقی قوت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقالی کسی داخلی انقلاب کا عملی اظہار نہیں ہوتی بلکہ دوسرے افراد یا دوسری اقوام سے ذہنی اعتبار سے مرعوب ہو کر ان کے سطحی اور خارجی حالات کو اپنانے کی ناکام اور بھونڈی کوشش ہوتی ہے۔ کیا دنیا میں کبھی کوئی ایسا درخت بھی برگ وبار لا سکتا ہے جس کی اپنی کوئی جڑیں ہی نہ ہوں؟ اس ضمن میں ابن خلدون نے اس نقالی کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بالکل صحیح کہا ہے کہ جو افراد یا قومیں دوسروں کی نقالی کرتے ہیں وہ ہمیشہ ان کی برائیاں اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں مگر ان کی خوبیاں اپنانے کی ان میں کبھی ہمت نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جو ذہنی اعتبار سے مفلوج اور عملی لحاظ سے پست ہوں اور اس بات کے آرزومند ہوں کہ وہ اپنی ظاہری ہیئت

میں بعض ایسی تبدیلیاں پیدا کرلیں کہ اُن میں اور جن لوگوں سے وہ مرعوب ہیں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔

کسی قوم کے سارے خارجی حالات ایک ہی نوعیت کے نہیں ہوتے۔ اُس کے بعض اعمال بڑے ٹھوس اور وزن دار ہوتے ہیں اور وہ کسی مضبوط اور حیات آفریں تصور کی عملی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہی وہ مثبت اعمال ہیں جن کی وجہ سے کوئی قوم دنیا میں سربلند ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس کے بعض دوسرے اعمال میں بڑی سطحیت اور اوچھا پن پایا جاتا ہے جو اس کی ترقی کا نہیں بلکہ تنزل کا موجب ہوا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قوم کے سارے افراد زندگی کے ہر شعبے یا حیاتِ مستعار کے ہر لمحے اُس ضبط اور ایثار سے کام نہیں لے سکتے جو مثبت اعمال کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے اُس قوم میں مختلف نوعیتوں کی کمزوریاں راہ پانا شروع کرتی ہیں۔ نقالی کرنے والے افراد یا قومیں چونکہ پست ہمت، تخلیقی صلاحیتوں سے عاری اور ایثار اور قربانی سے ناآشنا ہوتی ہیں، اس لیے وہ ان برائیوں کو تو اپنا لیتی ہیں جن میں کوئی مشقت اٹھانی نہیں پڑتی، اور اُن اعمال سے دستکش رہتی ہیں جو محنت، عزم اور ضبطِ نفس کے طالب ہوں۔

یہ اصول یوں تو آج دنیائے اسلام کے ہر گوشے میں کارفرما نظر آتا ہے مگر ہم طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہم نے یورپ کی نقالی میں قومیت کے علمبردار بننے کی کوشش کی اور اس کے نتیجے میں ہمیں سوائے رسوائی ذلت و خواری اور باہمی سر پھٹول کے اور کوئی چیز ہاتھ نہ آئی۔ قوم پرستی کی تحریک بلاشبہ اپنے اندر بہت سی خامیاں رکھتی ہے اور یہ خامیاں اب اتنی نمایاں ہو کر سامنے آئی ہیں کہ اس کے بارے میں اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مگر خامیوں کے ساتھ اس میں کئی ایک خوبیاں بھی ہیں جن سے یورپ نے خوب فائدہ اٹھایا مگر ہم اس کی نقالی میں سوائے خامیوں اور برائیوں کے کوئی دوسری چیز اپنا نہ سکے۔ اس تحریک سے پہلے اہلِ یورپ پوپ کی غلامی میں بُری طرح گرفتار تھے۔ اس عہدے پر جو شخص بھی فائز ہوتا وہ جس طرح چاہتا عوام کے مذہبی احساسات سے کھیلتا۔ چونکہ مسیحیت انسان کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کے بارے میں کوئی واضح تعلیمات نہیں دیتی اس لیے ان

معاملات میں پوپ کے ذاتی خیالات ہی حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے تھے اور عوام انہیں فرامینِ الٰہی سمجھ کر بلا چون وچرا مانتے چلے جاتے تھے۔ پوپ کی اس حیثیت نے لوگوں کو ذہنی غلامی میں مبتلا کر رکھا تھا اور یہ صاحب اپنی اس اونچی حیثیت سے ہر طرح کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ اہلِ یورپ نے ان افسوسناک حالات کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس کیا کہ جب مسیحیت ہمیں اپنی اجتماعی زندگی کے لیے کوئی ضابطے نہیں دیتی تو ہم ایک شخص یا ایک گروہ کے ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھنے کے بجائے کیوں نہ خود اپنے قومی مفادات کو دیکھ کر اپنی زندگی کے معاملات کو طے کریں، اور اگر ہمیں قربانی دینی ہی ہے تو پوپ کی خاطر دینے کے بجائے اپنی قوم کی بھلائی کے لیے کیوں نہ دیں۔ اس لیے انہوں نے پوپ کی پرستش کے بجائے قوم کی پرستش شروع کر دی اور اجتماعی معاملات کو قومی سود وزیاں کے مطابق طے کرنا شروع کر دیا۔ فکر ونظر کی اس تبدیلی سے اُن کی فکری غلامی کی زنجیریں کٹیں، انہوں نے حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا شروع کیا، انہیں اپنی قوم اور اپنے قومی مفادات سے محبت ہونے لگی اور ان کے اندر اس کے لیے ایثار اور قربانی کا جذبہ بیدار ہوا۔ ان مثبت احساسات کی وجہ سے قوم کے مختلف طبقوں میں اتحاد واتفاق پیدا ہوا۔ قوم کے ہر فرد نے اپنی قوم کی سربلندی اور اپنے وطن کی بہتری کے لیے سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں اور پُوری ایک صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ پُوری دنیا کی زمامِ کار یورپ کے ہاتھ میں آگئی۔

ہم نے یورپ کی اس ترقی کو دیکھتے ہوئے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ جب تک ہم اپنے آپ پر قوم پرستی کا جنون سوار نہیں کرتے اس وقت تک ہماری فلاح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہم نے اسلام کی آفاقی اور روحانی اساس کو چھوڑ کر وطن اور رنگ کی مادی اساس پر اپنی قومیت کی تعمیر کرنی چاہی۔ مگر ہم کوشش کے باوجود اسے متعدد وجوہ کی بنا پر اپنانے میں سخت ناکام رہے۔

ان میں پہلی وجہ یہ ہے اسلام جہاں ہمیں انفرادی نیکی اور پرہیزگاری کے لیے ایک ضابطہ دیتا ہے وہاں ہمیں اجتماعی زندگی کے لیے بھی نہایت واضح اصول عطا کرتا ہے اور صدیوں تک ان اصولوں کے مطابق ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی گاڑی چلتی رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پرستی کا مسلک

اختیار کرنے کے ساتھ ہی ہمیں خدا پرستی کے بہت سے تقاضوں کو نظر انداز کرنا پڑا۔ اس طرح نہ صرف ہر مسلمان کے دل و دماغ میں بلکہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے درمیان شدید کشمکش شروع ہوگئی۔ یورپ میں اجتماعی تعلیمات کا منبع پوپ تھا اس لیے انہیں پس پشت ڈال کر لوگوں نے چین کا سانس لیا، مگر مسلمانوں میں چونکہ ان کا مبدا و ماخذ اللہ اور اس کا رسول ہے اس لیے انہیں ذہنی اور قلبی دونوں لحاظ سے سخت اضطراب سے سابقہ پیش آیا۔ ان کی عقل یہ باور نہ کر سکتی تھی کہ اللہ اور اُس کے رسول کی دی ہوئی ہدایت اُن کے لیے فوز و فلاح کا موجب بننے کے بجائے کسی اعتبار سے اُن کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ پھر ان کے سامنے یہ تاریخ بھی موجود تھی کہ اس ہدایت پر عمل پیرا ہونے سے انہیں دنیا میں اطمینان و سکون، عزت و وقار اور عظمت و سربلندی کی کیسی عظیم دولت نصیب ہوئی تھی اور اس سے انسانیت کو کیسے لاتعداد فائدے پہنچے تھے۔ ان حالات میں قوم پرستی کے مطالبات کے پیشِ نظر دین کے تقاضوں سے منہ موڑ لینا ان کے لیے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس مسلک کو ایک نہایت مختصر سے طبقے کے سوا کسی نے قبول نہ کیا اور اس طرح قوم متحد ہونے اور سرگرم عمل ہونے کے بجائے الٹی انتشار اور مایوسی کی شکار ہوئی اور اُس کی قوتیں تعمیر و ترقی کے بجائے باہمی سرپھٹول میں ضائع ہونے لگیں۔ ہم نے اس قوم پرستی سے جو کچھ حاصل کیا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خود اپنے بھائی بندوں کے خلاف شدید نفرت کے رجحانات پیدا کیے، ان کے اندر قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور قوم کے مختلف طبقات کے درمیان محبت اور یگانگت کی جگہ نفاق کے بیج بوئے۔ الغرض قوم پرستی کی اس تحریک سے ہم کوئی خیر تو حاصل نہ کر سکے البتہ اس کا سارا شر ہمارے حصے میں آگیا۔ اس تحریک سے مغربی قوموں میں تو جمہوریت نے نشوونما پائی، کیونکہ اس کے پیچھے جو مختلف محرکات کام کر رہے تھے ان میں ایک یہ احساس بھی کارفرما تھا کہ قوم کی فلاح و بقا کسی مخصوص فرد یا کسی مخصوص خاندان یا مخصوص طبقے سے وابستہ نہیں بلکہ قوم کا ہر فرد اس میں شریک ہے اس لیے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کے بھلے اور بُرے کے بارے میں سوچے اور اس ضمن میں اس کی جو رائے ہو اُسے بے کم و کاست بیان کر دے۔ اس رائے کو خواہ قبول کیا جائے یا رد کر دیا جائے، مگر اس کے اظہار کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ مگر ہمارے اندر یہی تحریک آمریت اور استبداد لے کر آئی۔ ہم اس کی خوبیوں میں سے کوئی خوبی بھی اپنا نہ سکے۔ صرف نفرت و حقارت، جبر و

استبداد، ایک دوسرے کے خلاف سخت بے اعتمادی، اپنوں ہی کو ملک و ملت کا دشمن ٹھہرانے اور ان کا گلا گھونٹنے، اور غیروں سے سیکھے ہوئے نظریات کو زبردستی اپنی قوم پر ٹھونسنے کا سبق ہم نے اس سے حاصل کیا۔ ہمارے ہاں ملت کے ہر فرد کو ملکی معاملات میں دخیل کرنے اور اس پر ان کی ذمہ داری ڈالنے کے بجائے اُسے زیادہ سے زیادہ نظرانداز کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے ذہن میں یہ خیال راسخ کیا گیا کہ تجھے ملت کی فکر کرنے کے بجائے خود اپنے بھلے بُرے کے بارے میں بھی نہ سوچنا چاہیے بلکہ یہ حق صرف حکمران طبقے کو سونپ کر خود اُس کی اطاعت و فرمانبرداری میں منہمک ہو جانا چاہیے۔

آج دنیا کا کونسا ایسا مسلمان ملک ہے جس میں حکومت کے کاروبار عوام کے منشا اور مرضی کے مطابق چل رہے ہیں؟ مصر، شام، ایران، عراق، الجزائر، سعودی عرب، الغرض مسلم آبادی کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس کے متعلق وثوق سے کہا جائے کہ وہاں کے حکمرانوں کے عزل و نصب میں آخری اختیار وہاں کے عوام کو حاصل ہے اور پھر یہ حکمران اُن کی امنگوں اور آرزوؤں کے مطابق امورِ مملکت چلانے کے پابند ہیں۔ وحی و الہام اور باری تعالیٰ سے براہِ راست ہدایت حاصل کرنے کا سلسلہ ختم الرسل، سید الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ اس بنا پر کوئی شخص یا طبقہ اب اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے افکار ہر خطا سے منزہ اور اس کی آراء ہر کمزوری سے پاک ہیں۔ ہم زبان کی حد تک اسی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے معاملات باہمی صلاح مشورے سے طے کرنے چاہئیں۔ مگر ہمارے ہاں عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ "ملت کے چند غم خوار" طاقت کے ذریعے اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں اور پھر طاقت ہی کے بل بوتے پر عوامی خواہشات کے علی الرغم اپنی مرضی کا سکہ چلاتے ہیں۔ اہلِ یورپ نے قومیت کی تحریک اپنا کر پوپ کی خدائی اور شہنشاہوں کی کبریائی کو ختم کیا۔ اپنے عام افراد کو پستی اور غلامی سے اٹھا کر اُنہیں ایک بااختیار ہستی بنایا۔ مگر ہمارے ہاں اس تحریک کے بطن سے آمریت نے جنم لیا۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم میں فکری آزادی کے اُن تقاضوں کو پورا کرنے کا حوصلہ نہیں جو یہ تحریک اپنے ساتھ لاتی تھی۔ جب ہر فرد کو امورِ مملکت کے چلانے میں شریک کیا جائے

تو پھر اُس کے خیالات کو بھی سننا پڑتا ہے، اس کے احتساب کو بھی برداشت کرنا ہوتا ہے اور اپنے طرزِ عمل کے بارے میں اُسے زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنا پڑتا ہے۔ یہ جان جوکھوں کا کام ہے جسے پست ہمت نقال کبھی سرانجام نہیں دے سکتے۔ قوم پرستی انہیں قبول ہے، مگر افرادِ قوم کی آزادی انہیں قبول نہیں۔

تاریخ کی دوسری بڑی صداقت جسے مسلمان مغرب کی بے مغز نقالی میں نظر انداز کر گئے ہیں وہ یہ ہے کہ وطن، رنگ، نسل زبان پر قومیت کی بنیاد خواہ وقتی طور پر کتنی مضبوط نظر آئے مگر جلد ہی یہ متزلزل ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں جس قوم کی تشکیل کسی حیات آفریں تصور پر کی جائے وہ زیادہ دیرپا اور مضبوط ہوتی ہے۔ وطن، رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود سب محدود چیزیں ہیں۔ ان کے اندر وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ آپ اگر عربوں کو ایک قوم بنانا چاہتے ہیں تو قدرتی طور پر غیر عربوں کے لیے اس کا دروازہ بند ہو گا۔ آپ اگر سفید نسل والوں کو ایک سلک میں منسلک کرنے کے خواہشمند ہوں گے تو سیاہ زرد اور گندمی نسل والوں کے لیے اس میں کوئی دلچسپی نہ ہو گی۔ قومیت کو اس طرح چند مادی حدود سے محدود کرنے کا وہی نقصان ہوتا ہے جو پانی کو ایک مقام پر مقید کرنے کا ہوتا ہے۔ کچھ مدت تک تو اس پانی کی افادیت ہوتی ہے مگر چونکہ اس میں باہر سے مزید پانی شامل نہیں ہو سکتا اس لیے یہ جلد ہی متعفن ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی حال قوموں کا ہے۔ جو قومیں نظریات کی اساس پر منظم ہوتی ہیں ان کی حیثیت ایک بہتے ہوئے دھارے کی ہوتی ہے جس میں ہر لمحہ اور ہر مقام پر مختلف اطراف سے تازہ پانی بلا روک ٹوک ملتا رہتا ہے اور اس طرح اُس دھارے کی قوت و طاقت اور اس کی رفتار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر جو قومیں اپنے آپ کو مادی حدبندیوں میں مقید کرنے کی کوشش کرتی ہیں وہ چند سالوں کے بعد ہی اپنی قوت کھو بیٹھتی ہیں۔ اہلِ مغرب اس حقیقت کو بھانپ کر اپنے فکر و نظر کے زاویوں میں بنیادی تبدیلی پیدا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اب وہ جس چیز کا پرچار کرتے ہیں وہ رنگ و نسل اور وطن کی بجائے نظریات و اقدار ہیں۔ مثلاً اب کوئی یہ نہیں کہتا کہ امریکہ اور برطانیہ اور روس کی برتری قائم ہونی چاہیے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت اور آزادی یا معاشی تحفظ، یا معاشرتی عدل کو

دنیا میں کامیاب و کامران ہونا چاہیے۔

تاریخ کی ایک اور بڑی حقیقت جس کا اس دور کے مسلمان اچھی طرح ادراک نہیں کر سکے وہ یہ ہے کہ مادی اسباب ہمیشہ ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کبھی کسی قوم کو زندگی کی حرارت اور ولولہ عطا نہیں کر سکتے۔ جو قومیں صرف انہیں اپنی حیات کا مقصود و مطلوب ٹھہرا کر ان کے حصول میں سرگرداں ہوتی ہیں انہیں یہ کبھی حاصل نہیں ہوتے۔ اور اگر ان کی معمولی سی مقدار حاصل بھی ہو جائے تو وہ مفید اور کارآمد ہونے کے بجائے سخت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس قسم کی بے مغز قوموں کے ہاتھ میں مادی وسائل اسی طرح خطرناک ہوتے ہیں جس طرح کسی اناڑی یا کسی بچے کے ہاتھ میں بے نیام تلوار۔ وہ انہیں صحیح طور پر استعمال نہیں کر سکتیں، بلکہ بسا اوقات ان کے فراہم کیے ہوئے ہتھیار ان کا دشمن استعمال کرتا ہے۔ یہ وسائل اسی صورت میں مفید ہوتے ہیں جب یہ کسی بلند نصب العین کے حصول کی جدوجہد کے نتیجے میں ہاتھ آئیں اور ان سے قوم اسی وقت ٹھیک کام لیتی ہے جبکہ اس کے ایک ایک سپاہی اور فوجی افسر کے دل میں نصب العین کے عشق کی آگ بھڑک رہی ہو۔ اصل میں کسی قوم کی سربلندی کا فطری راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قوم سب سے پہلے کسی حیات آفریں نصب العین کو پورے خلوص کے ساتھ اپنا کر اس کے حصول کے لیے عملی جدوجہد کرے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ اس جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ قوت و طاقت فراہم کرے گی تاکہ وہ اپنے مقدس نظریۂ حیات کی کامیابی کے ساتھ محافظت و پاسبانی کرے اور اس کی مخالف قوتوں کا زور توڑے اور بالآخر انہیں اس کے سامنے سرنگوں کرنے میں کامیاب ہو۔ جس چیز کی حیثیت محض ذریعہ کی ہو اُسے اگر غایت بنا لیا جائے تو اس سے معاملہ کبھی ٹھیک نہیں ہوتا بلکہ پیچیدگیاں بڑھ جاتی ہیں۔

مسلمان آج جس فکری اور عملی پریشانی کا شکار ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے غلطی سے یہ فرض کر لیا ہے کہ مادی اسباب کی فراہمی کو زندگی کا مقصود ٹھیرا کر اس میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے یہ ایک ایسی فکری لغزش ہے جس کا ہم گزشتہ ایک سو سال سے ارتکاب کر رہے ہیں اور کسی صحیح نتیجہ پر

نہیں پہنچتے۔ اس طرزِ فکر میں جو خامی ہے وہ ادنیٰ تامل سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ اگر محض دنیاوی مال و متاع کی فراوانی کسی قوم کی ترقی کی ضمانت ہوتی تو پھر اسے کبھی زوال نہ آتا اور انسان باری تعالیٰ کی اس حکمت "وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ" کے کرشموں کا کبھی مشاہدہ نہ کرسکتا۔ ایک قوم جسے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مادی طاقت ہاتھ آجاتی وہ قیامت تک سربلند ہی رہتی اور اسے کبھی زوال نہ آتا۔ مگر پوری انسانی تاریخ اس کے خلاف شہادت فراہم کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بالکل غیر معروف اور کمزور قوم میں اچانک زندگی کی حرکت و حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی صفوں میں جہاں انتشار کے علاوہ اور کوئی بات دکھائی نہ دیتی تھی، اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ وہ قوت و طاقت کو غلام بناتی ہے اور دنیا پر چھا جاتی ہے۔ پھر جب وہ دنیا پر چھائی ہوئی ہوتی ہے، اس کے قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں اور کوئی دوسری دبی ہوئی غیر معروف قوم اٹھ کر اس کا تختہ الٹ دیتی ہے، اور تاریخ کے وہی اوراق جو اس کے کارناموں سے جگمگاتے تھے وہی اس کے مدفن بھی بنتے ہیں۔ عاد و ثمود کی قومیں، روم و یونان کی قومیں، مصر اور ایران کی قومیں مسلمان اور عیسائی قومیں، پھر دورِ جدید میں برطانیہ، جرمنی، جاپان، فرانس الغرض ماضی و حال کی کونسی قوم ایسی ہے جسے عروج حاصل ہونے کے ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ مادی اسباب فراہم نہ ہوئے ہوں۔ مگر جب اس پر اضمحلال طاری ہوا تو یہ اسباب اسے زوال سے بچانے میں یکسر ناکام رہے بلکہ ان اسباب ہی نے اس کی کمر توڑ دی۔

دور نہ جائیے، چین کے حالات پر ہی غور کیجیے۔ چینی قوم کے پاس یہی ملک تھا، اس کے پاس قدرت کے یہی عطیات تھے، مگر اس ملک اور ان عطیات کے ہوتے ہوئے بھی یہ دنیا کی سب سے زیادہ نامراد قوم تھی۔ جاپان جیسا چھوٹا ملک جس وقت چاہتا اسے دبا لیتا۔ ترقی تو در کنار اس کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ مگر اس نے چند سال پیشتر ایک نصب العین کو دل و جان سے اپنایا اور اسے اپنی زندگی کا مقصود قرار دیا۔ پھر اس کے حصول کے لیے جدوجہد شروع کی اور دیکھتے دیکھتے دنیا کی طاقتور قوم بن گئی۔ جاپان تو خیر اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے دنیا کی بڑی بڑی قومیں آج اس سے خائف ہیں۔ اس قوم کی نسل نہیں بدلی، اس کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا تھا اس

میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، اس کے ملک کے جغرافیائی حالات میں کوئی تغیر رُونما نہیں ہوا اس کے قدرتی وسائل نے اب کسی غیر معمولی فیاضی کا ثبوت نہیں دیا۔ وہی قوم ہے، اس کی وہی نسل ہے، وہی اس کا ملک اور وہی اُس کے وسائل ہیں۔ مگر نصب العین کے عشق نے اسے سرتا پا بدل کر رکھ دیا ہے اور آج اگر اس کے قبرستانوں سے مُردے زندہ ہو کر اپنے بھائی بندوں کو دیکھنے کے لیے آئیں تو وہ ان کی ان نئی سرگرمیوں کو دیکھ کر انہیں پہچاننے سے قاصر رہیں۔

اس قوم کے مقابلے میں مسلمانوں کو دیکھیے۔ وہ تعداد میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ اس سے بہت زیادہ رقبہ ان کے پاس ہے۔ اس سے بہت زیادہ وسائل ان کو میسّر ہیں۔ اُن کا ماضی کا ورثہ چینی قوم سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اُن کے دین نے جو نصب العین اور ضابطۂ حیات ان کو دیا ہے اس کا مقابلہ چینی تو کیا، دنیا کی کسی قوم کا بھی نصب العین اور ضابطۂ حیات نہیں کر سکتا۔ وہ چونکہ خالقِ کائنات نے انسان کی ہدایت کے لیے دیا ہے اس لیے وہ سراپا خیر ہی ہے۔ کسی خامی کا اس میں شائبہ تک نہیں ہے۔ اس میں غیر معمولی توازن اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس کا دائرہ پوری زندگی پر حاوی ہے۔ پھر اس نصب العین اور ضابطۂ حیات میں ایک تقدس پایا جاتا ہے جو انسانوں کے روحانی احساس کی بھی تسکین کرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ آج ہر جگہ ذلیل ہو رہے ہیں۔ مٹھی بھر قوموں کا دنیا میں وزن ہے مگر ان کا کوئی وزن نہیں۔ دنیا انہیں اپنے سینے پر بار سمجھ رہی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی مردہ رُوح کو زندہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ مُردہ جسم کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل جمع کرنے کی فکر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ وسائل اس کے لیے کچھ مفید اور کار آمد ہونے کے بجائے اس کے لیے تکلیف اور مصیبت کا موجب بن رہے ہیں۔

اہل چین کی روح میں چونکہ قوت و طاقت ہے اس لیے اُن کا پورا نظامِ زندگی اُسی طرح ٹھیک چل رہا ہے جس طرح کہ کسی تندرست فرد کے اعضاء و جوارح ٹھیک کام کرتے ہیں۔ ایک صحت مند آدمی جب

کوئی چیز کھاتا ہے تو وہ اس کا جزو بدن بن کر اُسے قوت و توانائی بخشتی ہے۔ مگر جب بیمار آدمی اُسی چیز کو استعمال کرتا ہے تو وہ اُس کے جسم میں متعدد عوارض پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ با مقصد قوم کے ہاتھ میں جب مادّی وسائل آتے ہیں تو وہ ان سے کس طرح بھرپور فائدہ اٹھا کر اپنے اندر بہتر توانائی اور بہتر کارکردگی پیدا کرتی ہے اور اس سے بالآخر معاشرے کے ہر فرد کو کس طرح فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر اس کے برعکس جب ایک بے مقصد یا دوسرے لفظوں میں رُوح سے عاری قوم مادّی وسائل کے حصول کے لیے کوشاں ہوتی ہے تو اسے نہ تو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوتی ہے اور نہ ان کے حاصل ہونے سے اس کی قوت بڑھتی ہے بلکہ اس کے اندر کئی قسم کی برائیاں پھیلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ دودھ ایک تندرست و توانا انسان کے لیے کتنی صحت بخش غذا ہے مگر اگر اسے مُردہ انسان کے مُنہ میں انڈیل دیا جائے تو سوائے لاش کا وزن بڑھنے اور تعفن میں اضافہ ہونے کے اور کونسا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔

آپ براہِ کرم سوچیے کہ آخر یہ مسلمان قوم کتنے عرصے سے مادّی وسائل فراہم کرنے کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور اس کے لیے کتنے عجیب و غریب منصوبے بنائے گئے ہیں۔ مال و متاع کی ہوس، مادّی اسباب کی محبت اور معیارِ زندگی بڑھانے کے جنون نے ہم سے کیا کچھ نہیں کروایا۔ اس کے لیے ہم نے اپنی دینی تعلیمات کو پسِ پشت ڈالا۔ غیروں کے سامنے دستِ سوال دراز کیا، اپنی ملی غیرت کو بیچا۔ اپنوں سے بگاڑ کیا اور اُن لوگوں کو گلے سے لگایا جنہوں نے ہماری قومی زندگی کے خلاف ہر مرحلے پر خوفناک سازشیں کی ہیں۔ مگر خدا کی ناراضگی اور اس ساری ذلت و خواری کے باوجود ہم دنیاوی اعتبار سے بھی وہ وسائل حاصل نہ کر سکے جو ایک نصب العین کے عشق میں سرشار قوم نے ۱۵ سال میں حاصل کر کے دکھا دیئے ہیں۔ ہم نے معیار کو بلند کرنے کے لیے اپنے آپ کو اربوں روپے کے قرضے میں جکڑا لیا مگر افسوس کہ ہمارا یہ خواب خواب ہی رہا، شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

پھر ان مادّی اسباب کی فراوانی نے ہمیں قوت عطا کرنے کے بجائے قومی نقطہ نظر سے مضمحل کیا۔ پُوری قوم دولت کی محبت میں ایسی اندھی ہوئی کہ اُس کے سامنے زندگی کا کوئی بلند تر مقصد

باقی نہ رہا۔ ہر فرد نے اپنی زندگی کا یہی مقصد سمجھا کہ کم سے کم وقت میں کم سے کم محنت صرف کر کے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کی جائے خواہ یہ کسی طریق سے حاصل ہو۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز تو پہلے ہی اٹھ چکی تھی اب قانونی اور غیر قانونی کی تمیز بھی باقی نہ رہی۔ مذہب کا احترام تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا، اب قانون کا احترام بھی جاتا رہا اور اسی طرح پوری قوم میں لاقانونیت پھیلنی شروع ہو گئی۔ ہر شخص نے کوئی قدم اٹھاتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ اس سے ملت کو فائدہ پہنچے گا یا نقصان، بلکہ اس نے صرف یہ دیکھا کہ اس کام کے کرنے سے اُس کے اپنے ہاتھ کہاں تک رنگے جا سکیں گے۔ اس سے عوام کے اندر جو اخلاقی انحطاط پیدا ہوا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی طویل جائزے کی ضرورت نہیں۔ آج مسلم ممالک میں رشوت ستانی، چور بازاری، اقربا نوازی، اسمگلنگ، قتل و غارت، ڈاکہ زنی اور دھوکہ بازی کا جو بازار گرم ہے اس کے تصور سے انسانی رُوح کانپ اٹھتی ہے۔

ان مادی وسائل کے فراہم کرنے میں جو تھوڑی سی کامیابی ہمیں نصیب ہوتی ہے وہ بھی ہمارے لیے وبالِ جان بن گئی ہے۔ یہ وسائل چونکہ کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے حصول کے لیے فراہم نہیں کیے گئے بلکہ انہیں خود مقصد سمجھ کر اکٹھا کیا گیا ہے اس لیے ان سے کما حقہٗ فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی جامع منصوبہ موجود نہیں۔ ہر فرد یا طبقہ انہیں دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہا ہے اور اس بات کے لیے ہر لمحہ کوشاں ہے کہ ان کا کوئی حصہ دوسرے کی طرف منتقل نہ ہونے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قومی دولت پورے ، شرے میں گردش کرنے اور ہر طبقے کو فائدہ پہنچانے کے بجائے ایک مخصوص طبقے کی میراث بن گئی ہے۔ جن محنت کشوں کے خون پسینے سے قومی دولت پیدا ہوتی ہے اُن کی اکثریت اُس سے محروم رہتی ہے اور اس کا اکثر و بیشتر حصہ ایک مختصر سا طبقہ ہتھیا لیتا ہے۔ اس دولت کے پیدا کرنے والے بنیادی ضروریات تک سے محروم رہتے ہیں، صرف چند خاندان اس پر دادِ عیش دیتے ہیں۔ یہ لوگ اسے تعمیری کاموں میں صرف کرنے کے بجائے اسے اپنی عیاشیوں میں اڑاتے ہیں۔ آپ اگر دنیا کے

(باقی صـ۶۳ پر)

تفہیم القرآن

الواقعہ

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْوَاقِعَہ کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول حضرت عبداللہ بن عباس نے سورتوں کی جو ترتیبِ نزول بیان کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ پہلے سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی، پھر الواقعہ اور اس کے بعد الشعراء (الاتقان للسُّیوطی)۔ یہی ترتیب عکرمہ نے بھی بیان کی ہے (بیہقی، دلائل النبوۃ)

اس کی تائید اُس قصّے سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے بارے میں ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب حضرت عمر اپنی بہن کے گھر میں داخل ہوئے تو سورۂ طٰہٰ پڑھی جا رہی تھی۔ اُن کی آہٹ سُن کر اِن لوگوں نے قرآن کے اوراق چھپا دیئے حضرت عمرؓ پہلے تو بہنوئی پر پل پڑے اور جب بہن اُن کو بچانے آئیں تو اُن کو بھی مارا یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ بہن کا خون بہتے دیکھ کر حضرت عمرؓ کو سخت ندامت ہوئی اور انہوں نے کہا، اچھا مجھے وہ صحیفہ دکھاؤ جسے تم نے چھپا لیا ہے۔ دیکھوں تو سہی اس میں کیا لکھا ہے۔ بہن نے کہا "آپ اپنے شرک کی وجہ سے نجس ہیں، وانہ لا یمسّہا الا الطاہر، اس صحیفے کو صرف طاہر آدمی ہی ہاتھ لگا سکتا ہے"۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اٹھ کر غسل کیا اور پھر اس صحیفے کو لے کر پڑھا۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ اُس وقت سورۂ واقعہ نازل ہو چکی تھی، کیونکہ اسی میں آیت لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ وارد ہوئی ہے اور یہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ ہجرتِ حبشہ کے بعد ۵ ؁ نبوی میں ایمان لائے ہیں۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع آخرت، توحید اور قرآن کے متعلق کفارِ مکہ کے شبہات کی تردید ہے۔ وہ سب سے زیادہ جس چیز کو ناقابلِ یقین قرار دیتے تھے وہ یہ تھی کہ کبھی قیامت برپا ہوگی

جس میں زمین و آسمان کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر تمام مرے ہوئے انسان دوبارہ جلا اٹھائے جائیں گے اور اُن کا محاسبہ ہوگا اور نیک انسان جنت کے باغوں میں رکھے جائیں گے اور گناہ گار انسان دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ یہ سب خیالی باتیں ہیں جن کا عالمِ واقعہ میں پیش آنا غیر ممکن ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ جب وہ واقعہ پیش آجائے گا اُس وقت کوئی یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ پیش نہیں آیا ہے، نہ کسی کی یہ طاقت ہوگی کہ اسے آتے آتے روک دے، یا واقعہ سے غیر واقعہ بنا دے۔ اُس وقت لازماً تمام انسان تین طبقات میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک، سابقین۔ دوسرے، عام صالحین۔ تیسرے وہ لوگ جو آخرت کے منکر رہے اور مرتے دم تک کفر و شرک اور گناہِ کبیرہ پر جمے رہے۔ اِن تینوں طبقات کے ساتھ جو معاملہ ہوگا اسے تفصیل کے ساتھ آیت ۷ سے ۵۶ تک بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد آیت ۵۷ سے ۷۴ تک اسلام کے اُن دونوں بنیادی عقائد کی صداقت پر پے در پے دلائل دیئے گئے ہیں جن کو ماننے سے کفّار انکار کر رہے تھے، یعنی توحید اور آخرت۔ اِن دلائل میں زمین و آسمان کی دوسری تمام چیزوں کو چھوڑ کر انسان کو خود اس کے اپنے وجود کی طرف اور اُس غذا کی طرف جسے وہ کھاتا ہے اور اُس پانی کی طرف جسے وہ پیتا ہے اور اس آگ کی طرف جس سے وہ اپنا کھانا پکاتا ہے، توجہ دلائی گئی ہے اور اسے اس سوال پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ تو جس خدا کے بنانے سے بنا ہے اور جس کے دیئے ہوئے سامانِ زیست پر پل رہا ہے اس کے مقابلے میں خود مختار ہونے، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی بجا لانے کا آخر تجھے حق کیا ہے؟ اور اس کے متعلق تو نے یہ کیسے گمان کر لیا کہ وہ ایک دفعہ تجھے وجود میں لے آنے کے بعد ایسا عاجز و درماندہ ہو جاتا ہے کہ دوبارہ تجھ کو وجود میں لانا چاہے بھی تو نہیں لا سکتا؟

پھر آیت ۷۵ سے ۸۲ تک قرآن کے بارے میں ان کے شکوک کی تردید کی گئی ہے اور ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ بدنصیبو، یہ عظیم الشان نعمت تمہارے پاس آئی ہے اور تم نے اپنا حصہ اس نعمت میں یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو اور اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُلٹی بے التفاتی

برتتے ہو۔ قرآن کی صداقت پر دو مختصر سے فقروں میں یہ بے نظیر دلیل پیش کی گئی ہے کہ اس پر کوئی غور کرے تو اس کے اندر ویسا ہی محکم نظام پائے گا جیسا کائنات کے تاروں اور سیاروں کا نظام محکم ہے، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مصنف وہی ہے جس نے کائنات کا یہ نظام بنایا ہے۔ پھر کفار سے کہا گیا ہے کہ یہ کتاب اُس نوشتۂ تقدیر میں ثبت ہے جو مخلوقات کی دست رس سے باہر ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شیاطین لاتے ہیں، حالانکہ لوح محفوظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جس ذریعہ سے یہ پہنچتی ہے اس میں پاک نفس فرشتوں کے سوا کسی کا ذرہ برابر بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

آخر میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ تو کتنی ہی من ترانیاں ہانکے اور اپنی خود مختاری کے گھمنڈ میں کتنا ہی حقائق کی طرف سے اندھا ہو جائے، مگر موت کا وقت تیری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ اُس وقت تو بالکل بے بس ہوتا ہے۔ اپنے ماں باپ کو نہیں بچا سکتا۔ اپنی اولاد کو نہیں بچا سکتا۔ اپنے پیروں اور پیشواؤں اور محبوب ترین لیڈروں کو نہیں بچا سکتا۔ سب تیری آنکھوں کے سامنے مرتے ہیں اور تو دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اگر کوئی بالاتر طاقت تیرے اوپر فرمانروا نہیں ہے اور تیرا یہ زعم درست ہے کہ دنیا میں بس تو ہی تو ہے، کوئی خدا نہیں ہے، تو کسی مرنے والے کی نکلتی ہوئی جان کو پلٹا کیوں نہیں لاتا؟ جس طرح تو اس معاملہ میں بے بس ہے اُسی طرح خدا کے محاسبے اور اس کی جزا و سزا کو بھی روک دینا تیرے اختیار میں نہیں ہے۔ تو خواہ مانے یا نہ مانے۔ موت کے بعد ہر مرنے والا اپنا انجام دیکھ کر رہے گا۔ مقربین میں سے ہو تو مقربین کا انجام دیکھے گا۔ صالحین میں سے ہو تو صالحین کا انجام دیکھے گا۔ اور جھٹلانے والے مجرموں میں سے ہو تو وہ انجام دیکھے گا جو ایسے مجرموں کے لیے مقدر ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا[1]۔ وہ تہ و بالا کر دینے والی آفت ہوگی[2]۔ زمین اس وقت یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی[3] اور پہاڑ اس طرح ریزہ

---

[1] اِس فقرے سے کلام کا آغاز خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ اُن باتوں کا جواب ہے جو اُس وقت کفار کی مجلسوں میں قیامت کے خلاف بنائی جا رہی تھیں۔ زمانہ وہ تھا جب مکہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نئی نئی اسلام کی دعوت سن رہے تھے۔ اُس میں جو چیز انہیں سب سے زیادہ عجیب اور بعید از عقل و امکان نظر آتی تھی وہ یہ تھی کہ ایک روز زمین و آسمان کا یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں سب اگلے پچھلے مرے ہوئے لوگ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ یہ بات سُن کر حیرت سے اُن کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ آخر یہ زمین، یہ پہاڑ، یہ سمندر، یہ چاند، یہ سورج کہاں چلے جائیں گے؟ صدیوں کے گڑے مُردے کیسے جی اٹھیں گے؟ مرنے کے بعد دوسری زندگی، اور پھر اس میں بہشت کے باغ اور جہنم کی آگ، آخر یہ خواب و خیال کی باتیں عقل و ہوش رکھتے ہوتے ہم کیسے مان لیں؟ یہی چہ میگوئیاں اُس وقت مکہ میں ہر جگہ ہو رہی تھیں۔ اِس پس منظر میں فرمایا گیا ہے کہ جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا اُس وقت کوئی اُسے جھٹلانے والا نہ ہوگا۔

اِس ارشاد میں قیامت کے لیے "واقعہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی قریب قریب وہی ہیں جس کے لیے اُردو زبان میں ہونی شُدنی کے الفاظ بولے جاتے ہیں، یعنی وہ ایسی چیز ہے جسے لازماً پیش آکر ہی رہنا ہے۔ پھر اس کے پیش آنے کو "وَقَعَتْ" کہا گیا ہے جو عربی زبان میں کسی بُرے حادثہ کے اچانک برپا ہو جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے وقوع کا ٹل جانا اور اس کا آتے آتے رُک جانا اور اُس کی آمد کا پھیر دیا جانا ممکن نہ ہوگا، یا بالفاظِ دیگر کوئی طاقت پھر اُس کو واقعہ سے غیر واقعہ بنا دینے والی نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ کوئی متنفس اُس وقت یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔

[2] اصل الفاظ ہیں خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ "گرانے والی اور اٹھانے والی"۔ اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا

ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے۔
تم لوگ اُس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے[۴]:
دائیں بازو والے[۵]، سو دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا۔
اور بائیں بازو والے[۶]، تو بائیں بازو والوں (کی بدنصیبی) کا کیا ٹھکانا۔

ہے کہ وہ سب کچھ اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دے گی۔ نیچے کی چیزیں اوپر اور اوپر کی چیزیں نیچے ہو جائیں گی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گرے ہوئے لوگوں کو اٹھانے والی اور اُٹھے ہوئے لوگوں کو گرانے والی ہوگی؛ یعنی اس کے آنے پر انسانوں کے درمیان عزت و ذلت کا فیصلہ ایک دوسری ہی بنیاد پر ہو گا۔ جو دنیا میں عزت والے بنے پھرتے تھے وہ ذلیل ہو جائیں گے اور جو ذلیل سمجھے جاتے تھے وہ عزت پائیں گے۔

[۳] یعنی وہ کوئی مقامی زلزلہ نہ ہوگا جو کسی محدود علاقے میں آئے، بلکہ پوری کی پوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی۔ اُس کو یک لخت ایک زبردست جھٹکا لگے گا جس سے وہ لرز کر رہ جائے گی۔

[۴] خطاب اگرچہ بظاہر اُن لوگوں سے ہے جنہیں یہ کلام سنایا جا رہا تھا، یا جو اب اِسے پڑھیں یا سُنیں، لیکن دراصل پوری نوع انسانی اس کی مخاطب ہے۔ تمام انسان جو اول روز آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہیں وہ سب آخر کار تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

[۵] اصل میں لفظ اصحاب المَیمنہ استعمال ہوا ہے۔ مَیمنہ عربی قاعدے کے مطابق یَمین سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں، اور یُمن سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی ہیں فالِ نیک۔ اگر اس کو یمین سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنہ کے معنی ہونگے "سیدھے ہاتھ والے"۔ لیکن اس سے لغوی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اس کا مطلب ہے عالی مرتبہ لوگ۔ اہلِ عرب سیدھے ہاتھ کو قوت اور رفعت اور عزت کا نشان سمجھتے تھے۔ جس کا احترام مقصود ہوتا تھا اُسے مجلس میں سیدھے ہاتھ پر بٹھاتے تھے۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ میرے دل میں اس کی بڑی عزت ہے تو کہتے فلانٌ منّی بالیمین، "وہ تو میرے سیدھے ہاتھ کی طرف ہے"۔ اُردو میں بھی کسی شخص کو کسی بڑی ہستی کا دستِ راست اسی معنی میں کہا جاتا ہے کہ وہ اُس کا خاص آدمی ہے۔ اور اگر اس کو یُمن سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنہ کے معنی ہونگے خوش نصیب اور نیک بخت لوگ۔

اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں۔ؔ وہی تو مقرّب لوگ ہیں۔ نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے۔

؎ اصل میں لفظ اصحاب المشئمہ استعمال ہُوا ہے۔ مَشئمہ، شُؤم سے ہے جس کے معنی بدبختی، نحوست اور بدفالی کے ہیں۔ اور عربی زبان میں بائیں ہاتھ کو بھی شُؤمیٰ کہا جاتا ہے۔ اردو میں شومیٔ قسمت اسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ اہلِ عرب شمال (بائیں ہاتھ) اور شُؤم (فالِ بد) کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں بایاں ہاتھ کمزوری اور ذلّت کا نشان تھا۔ سفر کو جاتے ہوئے اگر پرندہ اڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف جاتا تو وہ اس کو بُری فال سمجھتے تھے۔ کسی کو اپنے بائیں ہاتھ بٹھاتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ وہ اسے کمتر درجے کا آدمی سمجھتے ہیں۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہو کہ میرے ہاں اس کی کوئی عزت نہیں تو کہا جاتا کہ فلان منی بالشمال "وہ میرے بائیں ہاتھ کی طرف ہے"۔ اُردو میں بھی کسی کام کو بہت ہلکا اور آسان قرار دینا ہو تو کہا جاتا ہے یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پس اصحاب المشئمہ سے مراد ہیں بدبخت لوگ، یا وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلّت سے دوچار ہوں گے اور دربارِ الٰہی میں بائیں طرف کھڑے کیے جائیں گے۔

؎ سابقین (آگے والوں) سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیکی اور حق پرستی میں سب پر سبقت لے گئے ہوں، بھلائی کے ہر کام میں سب سے آگے ہوں، خدا اور رسُول کی پکار پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے ہوں، جہاد کا معاملہ ہو یا انفاق فی سبیل اللہ کا یا خدمتِ خلق کا یا دعوتِ خیر اور تبلیغِ حق کا، غرض دنیا میں بھلائی پھیلانے اور برائی مٹانے کے لیے ایثار و قربانی اور محنت و جانفشانی کا جو موقع بھی پیش آئے اس میں وہی آگے بڑھ کر کام کرنے والے ہوں۔ اس بنا پر آخرت میں بھی سب سے آگے وہی رکھے جائیں گے۔ گویا وہاں اللہ تعالیٰ کے دربار کا نقشہ یہ ہوگا کہ دائیں بازو میں صالحین، بائیں بازو میں فاسقین، اور سب سے آگے بارگاہِ خداوندی کے قریب سابقین۔ حدیث میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا "جانتے ہو قیامت کے روز کون لوگ سب سے پہلے پہنچ کر اللہ کے سایہ میں جگہ پائیں گے؟" لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اللہ کا رسول ہی زیادہ جانتا ہے۔ فرمایا الذین اذا اعطوا الحق قبلوہ، واذا سئلوہ بذلوہ، وحکموا للناس کحکمہم لانفسہم "وہ جن کا حال یہ تھا کہ جب ان کے آگے حق پیش کیا گیا انہوں نے قبول کر لیا، جب ان سے حق مانگا گیا انہوں نے ادا کر دیا، اور دوسروں کے معاملہ میں ان کا

اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم۔شہ مرصّع تختوں پر تکیے لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ اُن کی مجلسوں میں اَبدی لڑکے شہ شرابِ چشمۂ جاری سے لبریز پیالے اور کنٹر اور ساغر لیے دوڑتے پھرتے ہونگے جسے

فیصلہ وہی کچھ تھا جو خود اپنی ذات کے معاملہ میں تھا" (مُسند احمد)

شہ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اوّلین اور آخرین یعنی اگلوں اور پچھلوں سے مُراد کون ہیں؟ ایک گروہ کا خیال ہے کہ آدم علیہ السلام کے وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک جتنی اُمتیں گزری ہیں وہ اوّلین ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد قیامت تک کے لوگ آخرین ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ بعثتِ محمدی سے پہلے ہزار ہا برس کے دوران میں جتنے انسان گزرے ہیں اُن کے سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی، اور حضورؐ کی بعثت کے بعد سے قیامت تک آنے والے انسانوں میں سے جو لوگ سابقین کا مرتبہ پائیں گے اُن کی تعداد کم ہوگی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہاں اوّلین و آخرین سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے اوّلین و آخرین ہیں۔ یعنی آپ کی اُمت میں ابتدائی دَور کے لوگ اوّلین ہیں جن میں سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی، اور بعد کے لوگ آخرین ہیں جن میں سابقین کی تعداد کم ہوگی۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد ہر نبی کی اُمت کے اوّلین و آخرین ہیں، یعنی ہر نبی کے ابتدائی پیروؤں میں سابقین بہت ہونگے اور بعد کے آنے والوں میں وہ کم پائے جائیں گے۔ آیت کے الفاظ اِن تینوں مفہوموں کے حامل ہیں اور بعید نہیں کہ یہ تینوں ہی صحیح ہوں، کیونکہ درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اِن کے علاوہ ایک اور مطلب بھی اِن الفاظ سے نکلتا ہے اور وہ بھی صحیح ہے کہ ہر پہلے دَور میں انسانی آبادی کے اندر سابقین کا تناسب زیادہ ہوگا اور بعد کے دَور میں ان کا تناسب کم نکلے گا۔ اس لیے کہ انسانی آبادی جس رفتار سے بڑھتی ہے، سبقت فی الخیرات کرنے والوں کی تعداد اُسی رفتار سے نہیں بڑھتی۔ گنتی کے اعتبار سے یہ لوگ چاہے پہلے دَور کے سابقین سے تعداد میں زیادہ ہوں، لیکن بحیثیتِ مجموعی دنیا کی آبادی کے مقابلے میں ان کا تناسب گھٹتا ہی چلا جاتا ہے۔

شہ اس سے مراد ہیں ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اُن کی عمر ہمیشہ ایک ہی حالت پر ٹھیری رہے گی۔ حضرت علیؓ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ اہلِ دنیا کے وہ بچے ہیں جو بالغ ہونے سے پہلے مر گئے، اس لیے نہ ان کی کچھ نیکیاں ہونگی کہ ان کی جزا پائیں اور نہ بدیاں ہونگی کہ ان کی سزا پائیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس سے مُراد صرف وہی اہلِ دنیا ہو سکتے ہیں جن کو جنت نصیب نہ ہوئی ہو۔ رہے مومنین صالحین، تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ

پی کر نہ اُن کا سر چکرائے گا نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا[۱۰]۔ اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چُن لیں، اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں[۱۱]۔ اور ان کے لیے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی، ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی[۱۲]۔ یہ سب کچھ اُن اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سُنیں گے[۱۳]۔ جو بات بھی ہوگی ٹھیک ہوگی[۱۴]۔

نے خود قرآن میں یہ ضمانت دی ہے کہ اُن کی ذرّیت ان کے ساتھ جنّت میں لا ملائی جائے گی (الطور، آیت ۲۱)۔ اسی کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو ابوداؤد طیالسی، طَبَرانی اور بَزّار نے حضرت انسؓ اور حضرت سَمُرہ بن جُندُب سے نقل کی ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مشرکین کے بچے اہلِ جنّت کے خادم ہوں گے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۲۶۔ الطور، حاشیہ ۱۹)

۱۰؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافّات، حاشیہ ۲۷۔ سورۂ محمد، حاشیہ ۲۲۔ الطور حاشیہ ۱۸۔

۱۱؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ طور، حاشیہ ۱۷۔

۱۲؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافّات حاشیہ ۲۸-۲۹۔ الدخان، حاشیہ ۴۲۔ الرحمٰن، حاشیہ ۵۱۔

۱۳؎ یہ جنت کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے، جسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے، کہ انسان کے کان وہاں بیہودگی، یاوہ گوئی، جھوٹ، غیبت، چغلی، بہتان، گالی، لاف و گزاف، طنز و تمسخر اور طعن و تشنیع کی باتیں سننے سے محفوظ ہوں گے۔ وہ بدزبان اور بدتمیز لوگوں کی سوسائٹی نہ ہوگی جس میں لوگ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالیں۔ وہ شریف اور مہذب لوگوں کا معاشرہ ہوگا جس کے اندر یہ لغویات ناپید ہوں گی۔ اگر کسی شخص کو اللہ نے کچھ بھی شائستگی اور مذاقِ سلیم سے نوازا ہو تو وہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دنیوی زندگی کا یہ کتنا بڑا عذاب ہے جس سے انسان کو جنت میں نجات پانے کی امید دلائی گئی ہے۔

۱۴؎ اصل الفاظ ہیں اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا۔ بعض مفسرین و مترجمین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ

اور دائیں بازو والے، دائیں بازو والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ وہ بے خار بیریوں[15]، اور تہ بر تہ چڑھے ہوئے کیلوں، اور دُور تک پھیلی ہوئی چھاؤں، اور ہر دم رواں پانی، اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں[16]، اور اونچی نشست گاہوں میں ہونگے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے[17]، اپنے شوہروں کی عاشق[18] اور عمر میں ہم سِن[19]

وہاں ہر طرف سلام سلام ہی کی آوازیں سننے میں آئیں گی۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد ہے قولِ سلیم، یعنی ایسی گفتگو جو عیوب کلام سے پاک ہو، جس میں وہ خرابیاں نہ ہوں جو پچھلے فقرے میں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں سلام کا لفظ قریب قریب اسی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے انگریزی میں لفظ SANE استعمال ہوتا ہے۔

[15] یعنی ایسی بیریاں جن کے درختوں میں کانٹے نہ ہونگے۔ ایک شخص تعجب کا اظہار کر سکتا ہے کہ بیر ایسا کونسا نفیس پھل ہے جس کے جنت میں ہونے کی خوشخبری سنائی جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جنت کے بیروں کا تو کیا ذکر، خود اس دنیا کے بھی بعض علاقوں میں یہ پھل اتنا لذیذ، خوشبودار اور میٹھا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ منہ کو لگنے کے بعد اسے چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور بیر جتنے اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں، ان کے درختوں میں کانٹے اتنے ہی کم ہوتے ہیں۔ اسی لیے جنت کے بیروں کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ ان کے درخت بالکل ہی کانٹوں سے خالی ہونگے، یعنی ایسی بہترین قسم کے ہونگے جو دنیا میں نہیں پائی جاتی۔

[16] اصل الفاظ ہیں لَا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ۔ لا مقطوعہ سے مراد یہ ہے کہ یہ پھل نہ موسمی ہونگے کہ موسم گزر جانے کے بعد وہ نہ مل سکیں، نہ ان کی پیداوار کا سلسلہ کبھی منقطع ہوگا کہ کسی باغ کے سارے پھل اگر توڑ لیے جائیں تو ایک مدت تک وہ بے ثمر رہ جائے، بلکہ ہر پھل وہاں ہر موسم میں ملے گا اور خواہ کتنا ہی کھایا جائے لگاتار پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ اور لا ممنوعہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے باغوں کی طرح وہاں کوئی روک ٹوک نہ ہوگی، نہ پھلوں کے توڑنے اور کھانے میں کوئی امر مانع ہوگا کہ درختوں پر کانٹے ہونے یا زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے توڑنے میں کوئی زحمت پیش آئے۔

[17] اس سے مراد دنیا کی وہ نیک خواتین ہیں جو اپنے ایمان و عملِ صالح کی بنا پر جنت میں جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو وہاں جوان بنا دیگا، خواہ وہ کتنی ہی بوڑھی ہو کر مری ہوں۔ نہایت خوبصورت بنا دیگا، خواہ دنیا میں

حسین رہی ہوں یا نہ رہی ہوں۔ باکرہ بنا دیگا۔ خواہ دنیا میں وہ کنواری مری ہوں یا بال بچوں والی ہو کر۔ ان کے شوہر بھی اگر ان کے ساتھ جنت میں پہنچیں گے تو وہ ان سے ملا دی جائیں گی، ورنہ اللہ تعالیٰ کسی اور جنتی سے ان کو بیاہ دیگا۔ اس آیت کی یہی تشریح متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ شمائل ترمذی میں روایت ہے کہ ایک بڑھیا نے حضورؐ سے عرض کیا میرے حق میں جنت کی دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہ ہوگی۔ وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ "اُسے بتاؤ، وہ بڑھاپے کی حالت میں داخلِ جنت نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم انہیں خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور باکرہ بنا دینگے"۔ ابن ابی حاتم نے حضرت سَلَمہ بن یزید کی یہ روایت نقل کی ہے کہ مَیں نے اس آیت کی تشریح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا "اس سے مراد دنیا کی عورتیں ہیں، خواہ وہ باکرہ مری ہوں یا شادی شدہ"۔ طَبَرانی میں حضرت ام سَلَمہ کی ایک طویل روایت ہے جس میں وہ جنت کی عورتوں کے متعلق قرآن مجید کے مختلف مقامات کا مطلب حضورؐ سے دریافت فرماتی ہیں۔ اس سلسلہ میں حضورؐ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ھُنّ اللواتی قبضن فی دار الدنیا عجائز رمصا شمطا خلقھن اللہ بعد الکبر فجعلھن عذارٰی" یہ وہ عورتیں ہیں جو دنیا کی زندگی میں مری ہیں۔ بوڑھی پھونس، آنکھوں میں چیپڑ، سر کے بال سفید۔ اس بڑھاپے کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو پھر سے باکرہ پیدا کر دے گا"۔ حضرت ام سَلَمہ پوچھتی ہیں اگر کسی عورت کے دنیا میں کئی شوہر رہ چکے ہوں اور وہ سب جنت میں جائیں تو وہ ان میں سے کس کو ملے گی؟ حضور فرماتے ہیں انھا تُخیّر فتختار احسنھم خلقا فتقول یا رب ان ھٰذا کان احسن خلقاً معی فزوجنیہا، یا ام سلمہ، ذھب حسن الخلق بخیر الدنیا والاٰخرۃ" "اس کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ جسے چاہے چُن لے، اور وہ اُس شخص کو چُنے گی جو ان میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرے گی کہ اے رب، اس کا برتاؤ میرے ساتھ سب سے اچھا تھا اس لیے مجھے اسی کی بیوی بنا دے۔ اے ام سلمہ، حسنِ اخلاق دنیا اور آخرت کی ساری بھلائی لوٹ لے گیا ہے"۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ رحمٰن، حاشیہ ۵۱)

۱۸؎ اصل میں لفظ عُرُباً استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں عورت کی بہترین نسوانی خوبیوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے مراد ایسی عورت ہے جو طرحدار ہو، خوش اطوار ہو، خوش گفتار ہو، نسوانی جذبات سے

اع

یہ کچھ دائیں بازو والوں کے لیے ہے۔ وہ اگلوں میں سے بھی بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے بھی بہت ۔۲۶

اور بائیں بازو والے، بائیں بازو والوں کی بدنصیبی کا کیا پوچھنا۔ وہ لُو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سایے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ آرام دہ۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔ کہتے تھے "کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے وہ باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں؟" اے نبی، اِن لوگوں سے کہو، یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے۔ پھر اے گمراہو اور جھٹلانے والو،

بریز ہو، اپنے شوہر کو دل و جان سے چاہتی ہو، اور اس کا شوہر بھی اس کا عاشق ہو۔

۲۶ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے شوہروں کی ہم سن ہوں گی۔ دوسرا یہ کہ وہ آپس میں ہم سن ہوں گی، یعنی تمام جنتی عورتیں ایک ہی عمر کی ہوں گی اور ہمیشہ اسی عمر کی رہیں گی۔ بعید نہیں کہ یہ دونوں ہی باتیں بیک وقت صحیح ہوں، یعنی یہ خواتین خود بھی ہم سن ہوں اور ان کے شوہر بھی ان کے ہم سن بنا دیے جائیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ یدخل اھل الجنۃ الجنۃ جردا مردا بیضا جعادا مکحلین ابناء ثلاث وثلاثین "اہلِ جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو ان کے جسم بالوں سے صاف ہوں گے، مسیں بھیگ رہی ہوں گی مگر ڈاڑھی نہ نکلی ہوگی۔ گورے چٹے ہوں گے۔ گٹھے ہوئے بدن ہوں گے۔ آنکھیں سرمگیں ہوں گی۔ سب کی عمریں ۳۳ سال کی ہوں گی" (مسند احمد، مرویات ابی ہریرہ)۔ قریب قریب یہی مضمون ترمذی میں حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے بھی مروی ہے۔

۲۷ یعنی خوشحالی نے ان پر اُلٹا اثر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہونے کے بجائے وہ اُلٹے کافرِ نعمت ہو گئے تھے۔ اپنی لذاتِ نفس میں منہمک ہو کر خدا کو بھول گئے تھے۔ اور گناہِ عظیم پر مصر تھے۔ "گناہِ عظیم" کا لفظ جامع ہے۔ اس سے مراد کفر و شرک اور دہریت بھی ہے اور اخلاق و اعمال کا ہر بڑا گناہ بھی۔

تم شجرِ زقوم[۲۱] کی غذا کھانے والے ہو۔ اُسی سے تم پیٹ بھروگے اور اُوپر سے کھولتا ہُوا پانی تونس لگے ہوئے اونٹ کی طرح پیوگے۔ یہ ہے بائیں بازو والوں کی ضیافت کا سامان روزِ جزا میں۔

ہم نے تمہیں[۲۲] پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے؟[۲۳] کبھی تم نے غور کیا، یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو، اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟[۲۴] ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے[۲۵]

---

[۲۱] زقوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۳۴۔

[۲۲] یہاں سے آیت ۷۴ تک جو دلائل پیش کیے گئے ہیں ان میں بیک وقت آخرت اور توحید، دونوں پر استدلال کیا گیا ہے۔ چونکہ مکہ کے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ان دونوں بنیادی اجزاء پر معترض تھے اس لیے یہاں دلائل اِس انداز سے دیئے گئے ہیں کہ آخرت کا ثبوت بھی ان سے ملتا ہے اور توحید کی صداقت کا بھی۔

[۲۳] یعنی اِس بات کی تصدیق کہ ہم ہی تمہارے رب اور معبود ہیں، اور ہم تمہیں دوبارہ بھی پیدا کرسکتے ہیں۔

[۲۴] اس مختصر سے فقرے میں ایک بڑا اہم سوال انسان کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ دنیا کی تمام دوسری چیزوں کو چھوڑ کر انسان اگر صرف اِسی ایک بات پر غور کرے کہ وہ خود کس طرح پیدا ہُوا ہے تو اسے نہ قرآن کی تعلیمِ توحید میں کوئی شک رہ سکتا ہے نہ اس کی تعلیمِ آخرت میں۔ انسان آخر اسی طرح تو پیدا ہوتا ہے کہ مرد اپنا نطفہ عورت کے رحم تک پہنچا دیتا ہے۔ مگر کیا اس نطفہ میں بچہ پیدا کرنے کی، اور لازماً انسان ہی کا بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت آپ سے آپ پیدا ہوگئی ہے؟ یا انسان نے خود پیدا کی ہے؟ یا خدا کے سوا کسی اور نے پیدا کردی ہے؟ اور کیا یہ مرد کے، یا عورت کے، یا دنیا کی کسی طاقت کے اختیار میں ہے کہ اس نطفے سے حمل کا استقرار کرادے؟ پھر استقرارِ حمل سے وضعِ حمل تک ماں کے پیٹ میں بچے کی درجہ بدرجہ تخلیق و پرورش، اور ہر بچے کی الگ صورت گری اور ہر بچے کے اندر مختلف ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک خاص تناسب کے ساتھ رکھنا جس سے وہ ایک خاص شخصیت کا انسان بن کر اٹھے، کیا یہ سب کچھ ایک خدا کے سوا کسی اور کا کام ہے؟ کیا اس میں کسی اور کا ذرہ برابر بھی کوئی دخل ہے؟ کیا یہ کام ماں باپ خود کرتے ہیں؟ یا کوئی ڈاکٹر کرتا ہے؟ یا وہ انبیاء اور اولیاء کرتے ہیں جو خود اسی طرح پیدا ہوئے ہیں؟ یا سورج اور چاند اور تارے کرتے ہیں جو خود ایک قانون کے غلام ہیں؟ یا وہ فطرت کرتی ہے جو بجائے خود علم، حکمت، ارادے اور اختیار سے عاری ہے؟ پھر کیا یہ فیصلہ کرنا بھی خدا کے سوا کسی کے اختیار میں ہے کہ بچہ لڑکی ہو

یا لڑکا؟ خوبصورت ہو یا بدصورت؟ طاقتور ہو یا کمزور؟ اندھا بہرا لنگڑا لولا ہو یا سمیع الاعضاء؟ ذہین ہو یا کُند ذہن؟ پھر کیا خدا کے سوا کوئی اور یہ طے کرتا ہے کہ قوموں کی تاریخ میں کس وقت کس قوم کے اندر کن اچھی یا بُری صلاحیتوں کے آدمی پیدا کرے جو اسے عروج پر لے جائیں یا زوال کی طرف دھکیل دیں؟ اگر کوئی شخص ضد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا نہ ہو تو وہ خود محسوس کرے گا کہ شرک یا دہریت کی بنیاد پر ان سوالات کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ان کا معقول جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان پُورا کا پُورا خدا کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ اور جب حقیقت یہ ہے تو خدا کے ساختہ و پرداختہ اِس انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اپنے خالق کے مقابلے میں آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے؟ یا اُس کے سوا کسی دوسرے کی بندگی بجا لائے؟

توحید کی طرح یہ سوال آخرت کے معاملہ میں بھی فیصلہ کُن ہے۔ انسان کی تخلیق ایک ایسے کیڑے سے ہوتی ہے جو طاقتور خوردبین کے بغیر نظر تک نہیں آسکتا۔ یہ کیڑا عورت کے جسم کی تاریکیوں میں کسی وقت اُس نسوانی انڈے سے جا ملتا ہے جو اسی کی طرح ایک حقیر سا خوردبینی وجود ہوتا ہے۔ پھر ان دونوں کے ملنے سے ایک چھوٹا سا زندہ خلیہ بن جاتا ہے جو حیاتِ انسانی کا نقطۂ آغاز ہے، اور یہ خلیہ بھی اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ خوردبین کے بغیر اس کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس ذرا سے خلیے کو ترقی دے کر اللہ تعالیٰ ۹ مہینے چند روز کے اندر رحمِ مادر میں ایک جیتا جاگتا انسان بنا دیتا ہے، اور جب اس کی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو ماں کا جسم خود ہی اسے دھکیل کر دنیا میں اودھم مچانے کے لیے باہر پھینک دیتا ہے۔ تمام انسان اسی طرح دنیا میں آئے ہیں اور شب و روز اپنے ہی جیسے انسانوں کی پیدائش کا یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ اِس کے بعد صرف ایک عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ جو خدا اِس طرح انسانوں کو آج پیدا کر رہا ہے وہ کل کسی وقت اپنے ہی پیدا کیے ہوئے اِن انسانوں کو دوبارہ پیدا نہ کر سکے گا۔

۵۲؎ یعنی تمہاری پیدائش کی طرح تمہاری موت بھی ہمارے اختیار میں ہے۔ ہم یہ طے کرتے ہیں کہ کس کو ماں کے پیٹ ہی میں مر جانا ہے، اور کسے پیدا ہوتے ہی مر جانا ہے، اور کسے کس عمر تک پہنچ کر مرنا ہے۔ جس کی موت کا جو وقت ہم نے مقدر کر دیا ہے اس سے پہلے دنیا کی کوئی طاقت اسے مار نہیں سکتی، اور اس کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔ مرنے والے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کی آنکھوں کے

اور ہم اِس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔[۲۶] اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہو، پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟[۲۷]

سامنے مرتے ہیں، بلکہ ڈاکٹر خود بھی اپنے وقت پر مر جاتے ہیں۔ کبھی کوئی نہ موت کے وقت کو ٹال سکا ہے، نہ آتی ہوئی موت کو روک سکا ہے، نہ یہ معلوم کر سکا ہے کہ کس کی موت کس ذریعہ سے، کہاں، کس طرح واقع ہونے والی ہے۔

[۲۶] یعنی جس طرح ہم اس سے عاجز نہ تھے کہ تمہیں تمہاری موجودہ شکل و ہیئت میں پیدا کریں۔ اسی طرح ہم اس سے بھی عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری تخلیق کا طریقہ بدل کر کسی اور شکل و ہیئت میں، کچھ دوسری صفات و خصوصیات کے ساتھ تم کو پیدا کر دیں۔ آج تم کو ہم اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ تمہارا نطفہ قرار پاتا ہے اور تم ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ بن کر ایک بچے کی صورت میں برآمد ہوتے ہو۔ یہ طریق تخلیق بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا ہے۔ مگر ہمارے پاس بس یہی ایک لگا بندھا طریقہ نہیں ہے جس کے سوا ہم کوئی اور طریقہ نہ جانتے ہوں، یا نہ عمل میں لا سکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم تمہیں اُسی عمر کے انسان کی شکل میں پیدا کر سکتے ہیں جس عمر میں تم مرے تھے۔ آج تمہاری بینائی، سماعت اور دوسرے حواس کا پیمانہ ہم نے کچھ اور رکھا ہے۔ مگر ہمارے پاس انسان کے لیے بس یہی ایک پیمانہ نہیں ہے جسے ہم بدل نہ سکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم اسے بدل کر کچھ سے کچھ کر دینگے یہاں تک کہ تم وہ کچھ دیکھ اور سن سکو گے جو یہاں نہیں دیکھ سکتے اور نہیں سُن سکتے۔ آج تمہاری کھال اور تمہارے ہاتھ پاؤں اور تمہاری آنکھوں میں کوئی گویائی نہیں ہے۔ مگر زبان کو بولنے کی طاقت ہم ہی نے تو دی ہے۔ ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ قیامت کے روز تمہارا ہر عضو اور تمہارے جسم کی کھال کا ہر ٹکڑا ہمارے حکم سے بولنے لگے۔ آج تم ایک خاص عمر تک ہی جیتے ہو اور اس کے بعد مر جاتے ہو۔ یہ تمہارا جینا اور مرنا بھی ہمارے ہی مقرر کردہ ایک قانون کے تحت ہوتا ہے۔ کل ہم ایک دوسرا قانون تمہاری زندگی کے لیے بنا سکتے ہیں جس کے تحت تمہیں کبھی موت نہ آئے۔ آج تم ایک خاص حد تک ہی عذاب برداشت کر سکتے ہو، جس سے زائد عذاب اگر تمہیں دیا جائے تو تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضابطہ بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے۔ کل ہم تمہارے لیے ایک دوسرا ضابطہ بنا سکتے ہیں جس کے

کبھی تم نے سوچا، یہ بیج جو تم بوتے ہو، اِن سے کھیتیاں تم اُگاتے ہو یا اُن کے اُگانے والے ہم ہیں؟ ۲۸ھ
ہم چاہیں تو ان کھیتیوں کو بُھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو اُلٹی چٹی پڑ
گئی، بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں۔
کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا، یہ پانی جو تم ۲۹ پیتے ہو، اِسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے

تحت تم ایسا عذاب ایسی طویل مدت تک بھگت سکو گے جس کا تم تصور تک نہیں کر سکتے، اور کسی سخت سے سخت عذاب سے بھی تمہیں موت نہ آئے گی۔ آج تم سوچ نہیں سکتے کہ کوئی بوڑھا جوان ہو جائے، کبھی بیمار نہ ہو، کبھی اس پر بڑھاپا نہ آئے اور ہمیشہ ہمیشہ وہ ایک ہی عمر کا جوان رہے۔ مگر یہاں جوانی پر بڑھاپا ہمارے بنائے ہوئے قوانینِ حیات ہی کے مطابق تو آتا ہے۔ کل ہم تمہاری زندگی کے لیے کچھ دوسرے قوانین بنا سکتے ہیں جن کے مطابق جنت میں جاتے ہی ہر بوڑھا جوان ہو جائے اور اس کی جوانی و تندرستی لازوال ہو۔

۲۷ھ یعنی تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ پہلے تم کیسے پیدا کیے گئے تھے۔ کس طرح باپ کی صُلب سے وہ نطفہ منتقل ہوا جس سے تم وجود میں آئے۔ کس طرح رحمِ مادر میں، جو قبر سے کچھ کم تاریک نہ تھا، تمہیں پرورش کر کے زندہ انسان بنایا گیا۔ کس طرح ایک ذرّۂ بے مقدار کو نشوونما دے کر یہ دل و دماغ، یہ آنکھ کان اور یہ ہاتھ پاؤں اس میں پیدا کیے گئے اور عقل و شعور، علم و حکمت، صنعت و ایجاد اور تدبیر و تسخیر کی یہ حیرت انگیز صلاحیتیں اس کو عطا کی گئیں۔ کیا یہ معجزہ مُردوں کو دوبارہ جِلا اٹھانے سے کچھ کم عجیب ہے؟ اس عجیب معجزے کو جب تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور خود اس کی زندہ شہادت کے طور پر دنیا میں موجود ہو تو کیوں اس سے یہ سبق نہیں لیتے کہ جس خدا کی قدرت سے یہ معجزہ شب و روز رونما ہو رہا ہے اسی کی قدرت سے زندگی بعد موت اور حشر و نشر اور جنت و دوزخ کا معجزہ بھی رُونما ہو سکتا ہے؟

۲۸ھ اُوپر کا سوال لوگوں کو اِس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساختہ و پرداختہ ہو اور اسی کی تخلیق سے وجود میں آئے ہو۔ اب یہ دوسرا سوال انہیں اِس دوسری اہم حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ جس رزق پر تم پلتے ہو وہ بھی اللہ ہی تمہارے لیے پیدا کرتا ہے۔ جس طرح تمہاری پیدائش میں انسانی کوشش کا دخل اِس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ تمہارا باپ تمہاری ماں کے اندر نطفہ ڈال دے،

برسانے والے ہم ہیں؟[۲۹] ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں[۳۰]، پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟[۳۱]

اسی طرح تمہارے رزق کی پیداوار میں بھی انسان کی کوشش کا دخل اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے کہ کسان کھیتی میں بیج ڈال دے۔ زمین جس میں یہ کاشت کی جاتی ہے، تمہاری بنائی ہوئی نہیں ہے۔ اس زمین کو روئیدگی کی صلاحیت تم نے نہیں بخشی ہے۔ اس میں وہ مادّے جن سے تمہاری غذا کا سامان بہم پہنچتا ہے، تم نے فراہم نہیں کیے ہیں۔ اس کے اندر جو بیج تم ڈالتے ہو ان کو نشوونما کے قابل تم نے نہیں بنایا ہے۔ ان بیجوں میں یہ صلاحیت کہ ہر بیج سے اُسی نوع کا درخت پھوٹے جس کا وہ بیج ہے، تم نے پیدا نہیں کی ہے۔ اس کاشت کو لہلہاتی کھیتیوں میں تبدیل کرنے کے لیے زمین کے اندر جس عمل اور زمین کے اوپر جس ہوا، پانی، حرارت، بُرودت اور موسمی کیفیت کی ضرورت ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی تمہاری کسی تدبیر کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اللہ ہی کی قدرت اور اسی کی پروردگاری کا کرشمہ ہے۔ پھر جب تم وجود میں اسی کے لانے سے آئے ہو، اور اسی کے رزق سے پل رہے ہو، تو تم کو اس کے مقابلہ میں خود مختاری کا، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کا حق آخر کیسے پہنچتا ہے؟

اس آیت کا ظاہر استدلال تو توحید کے حق میں ہے، مگر اس میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس پر اگر آدمی تھوڑا سا مزید غور کرے تو اسی کے اندر آخرت کی دلیل بھی مل جاتی ہے۔ جو بیج زمین میں بویا جاتا ہے وہ بجائے خود مُردہ ہوتا ہے، مگر زمین کی قبر میں جب کسان اس کو دفن کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر وہ نباتی زندگی پیدا کر دیتا ہے جس سے کونپلیں پھوٹتی ہیں اور لہلہاتی ہوئی کھیتیاں شانِ بہار دکھاتی ہیں۔ یہ بے شمار مُردے ہماری آنکھوں کے سامنے آئے دن قبروں سے جی جی کر اُٹھ رہے ہیں۔ یہ معجزہ کیا کچھ کم عجیب ہے کہ کوئی شخص اُس دوسرے عجیب معجزے کو ناممکن قرار دے جس کی خبر قرآن ہمیں دے رہا ہے، یعنی انسانوں کی زندگی بعد موت۔

[۲۹] یعنی تمہاری بھوک مٹانے ہی کا نہیں، تمہاری پیاس بجھانے کا انتظام بھی ہمارا ہی کیا ہوا ہے۔ یہ پانی جو تمہاری زندگی کے لیے روٹی سے بھی زیادہ ضروری ہے، تمہارا اپنا فراہم کیا ہوا نہیں ہے بلکہ اسے ہم فراہم کرتے ہیں۔ زمین میں یہ سمندر ہم نے پیدا کیے ہیں۔ ہمارے سورج کی گرمی سے ان کا پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے۔ ہم نے اس پانی میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ ایک خاص درجۂ حرارت پر وہ بھاپ میں تبدیل ہو جاتے۔ ہماری

ہوائیں اسے لے کر اٹھتی ہیں۔ ہماری قدرت اور حکمت سے وہ بھاپ جمع ہو کر بادل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہمارے حکم سے یہ بادل ایک خاص تناسب سے تقسیم ہو کر زمین کے مختلف خطوں پر پھیلتے ہیں تاکہ جس خطۂ زمین کے لیے پانی کا جو حصہ مقرر کیا گیا ہے وہ اس کو پہنچ جائے۔ اور ہم بالائی فضا میں وہ برودت پیدا کرتے ہیں جس سے یہ بھاپ پھر سے پانی میں تبدیل ہوتی ہے۔ ہم تمہیں صرف وجود میں لا کر ہی نہیں رہ گئے ہیں بلکہ تمہاری پرورش کے یہ سارے انتظامات بھی ہم کر رہے ہیں جن کے بغیر تم جی نہیں سکتے۔ پھر ہماری تخلیق سے وجود میں آکر، ہمارا رزق کھا کر اور ہمارا پانی پی کر یہ حق تمہیں کہاں سے حاصل ہو گیا کہ ہمارے مقابلہ میں خود مختار رہو، یا ہمارے سوا کسی اور کی بندگی بجا لاؤ؟

۳۰ اس فقرے میں اللہ کی قدرت و حکمت کے ایک اہم کرشمے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو حیرت انگیز خواص رکھے ہیں، ان میں سے ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر خواہ کتنی ہی چیزیں تحلیل ہو جائیں، جب وہ حرارت کے اثر سے بھاپ میں تبدیل ہوتا ہے تو ساری آمیزشیں نیچے چھوڑ دیتا ہے اور صرف اپنے اصل آبی اجزاء کو لے کر ہوا میں اڑتا ہے۔ یہ خاصیت اگر اس میں نہ ہوتی تو بھاپ میں تبدیل ہوتے وقت بھی وہ سب چیزیں اس میں شامل رہتیں جو پانی ہونے کی حالت میں اس کے اندر تحلیل شدہ تھیں۔ اس صورت میں سمندر سے جو بھاپیں اٹھتیں ان میں سمندر کا نمک بھی شامل ہوتا اور ان کی بارش تمام روئے زمین کو زمینِ شور بنا دیتی۔ نہ انسان اس پانی کو پی کر جی سکتا تھا، نہ کسی قسم کی نباتات اس سے اگ سکتی تھی۔ اب کیا کوئی شخص دماغ میں ذرا سی بھی عقل رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اندھی بہری فطرت سے خود بخود پانی میں یہ حکیمانہ خاصیت پیدا ہو گئی ہے؟ یہ خاصیت جس کی بدولت کھاری سمندروں سے صاف ستھرا میٹھا پانی کشید ہو کر بارش کی شکل میں برستا ہے اور پھر دریاؤں، نہروں، چشموں اور کنووں کی شکل میں آب رسانی و آب پاشی کی خدمت انجام دیتا ہے، اس بات کی صریح شہادت فراہم کرتی ہے کہ ودیعت کرنے والے نے پانی میں اس کو خوب سوچ سمجھ کر بالارادہ اس مقصد کے لیے ودیعت کیا ہے کہ وہ اس کی پیدا کردہ مخلوقات کی پرورش کا ذریعہ بن سکے۔ جو مخلوق کھاری پانی سے پرورش پا سکتی تھی وہ اس نے سمندر میں پیدا کی اور وہاں وہ خوب جی رہی ہے۔ مگر جس مخلوق کو اس نے خشکی اور ہوا میں پیدا کیا تھا اس کی پرورش کے لیے میٹھا پانی درکار تھا اور اس کی فراہمی کے لیے بارش کا انتظام کرنے سے پہلے اس نے پانی کے اندر یہ خاصیت رکھ دی کہ گرمی سے بھاپ بنتے وقت وہ کوئی ایسی چیز لے کر نہ اڑے جو اس کے اندر تحلیل ہو گئی ہو۔

کبھی تم نے خیال کیا، یہ آگ جو تم سلگاتے ہو، اس کا درخت [۳۲] تم نے پیدا کیا ہے، یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اُس کو یاد دہانی کا ذریعہ [۳۳] اور حاجت مندوں [۳۴] کے لیے سامانِ زیست

[۳۱] بالفاظ دیگر کیوں یہ کفرانِ نعمت کرتے ہو کہ تم میں سے کوئی اس بارش کو دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتا ہے، اور کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ سمندر سے بادلوں کا اٹھنا اور پھر آسمان سے پانی بن کر برسنا ایک فطری چکّر ہے جو آپ سے آپ چلا جا رہا ہے، اور کوئی اسے خدا کی رحمت سمجھتا بھی ہے تو اُس خدا کا اپنے اوپر یہ حق نہیں مانتا کہ اُسی کے آگے سرِ اطاعت جھکائے؟ خدا کی اتنی بڑی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہو اور پھر جواب میں کفر و شرک اور فسق و نافرمانی کرتے ہو؟

[۳۲] درخت سے مُراد یا تو وہ درخت ہیں جن سے آگ جلانے کے لیے لکڑی فراہم ہوتی ہے۔ یا مَرخ اور عفار نامی وہ دو درخت ہیں جن کی ہری بھری ٹہنیوں کو ایک دوسرے پر مار کر قدیم زمانے میں اہلِ عرب آگ جھاڑا کرتے تھے۔

[۳۳] اس آگ کو یاد دہانی کا ذریعہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو ہر وقت روشن ہو کر انسان کو اُس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ اگر آگ نہ ہوتی تو انسان کی زندگی حیوان کی زندگی سے مختلف نہ ہو سکتی۔ آگ ہی سے انسان نے حیوانات کی طرح کچی غذائیں کھانے کے بجائے ان کو پکا کر کھانا شروع کیا اور پھر اس کے لیے صنعت و ایجاد کے نئے نئے دروازے کھلتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر خدا وہ ذرائع پیدا نہ کرتا جن سے آگ جلائی جا سکے، اور وہ آتش پذیر مادے پیدا نہ کرتا جو آگ سے جل سکیں، تو انسان کی ایجادی صلاحیتوں کا قفل ہی نہ کھلتا۔ مگر انسان یہ بات فراموش کر گیا ہے کہ اس کا خالق کوئی پروردگارِ حکیم ہے جس نے اسے ایک طرف انسانی قابلیتیں دے کر پیدا کیا تو دوسری طرف زمین میں وہ سروسامان بھی پیدا کر دیا جس سے اس کی یہ قابلیتیں رُوبعمل آ سکیں۔ وہ اگر غفلت میں مدہوش نہ ہو تو تنہا ایک آگ ہی اسے یہ یاد دلانے کے لیے کافی ہے کہ یہ کس کے احسانات اور کس کی نعمتیں ہیں جن سے وہ دنیا میں متمتع ہو رہا ہے۔

[۳۴] اصل میں لفظ "مُقوِین" استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے مختلف معنی اہلِ لغت نے بیان کیے ہیں۔ بعض اسے صحرا میں اُترے ہوئے مسافروں کے معنی میں لیتے ہیں۔ بعض اس کے معنی بھوکے آدمی کے لیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے مُراد وہ سب لوگ ہیں جو آگ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، خواہ وہ کھانا پکانے کا فائدہ ہو یا روشنی

بنایا ہے۔

پس اے نبی، اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو[۳۵] ع۲

کا یا تپش کا

[۳۵] یعنی اس کا مبارک نام لے کر یہ اظہار و اعلان کرو کہ وہ اُن تمام عیوب و نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جو کفّار و مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جو کفر و شرک کے ہر عقیدے اور منکرینِ آخرت کے ہر استدلال میں مضمر ہیں۔

ضروری تصحیح

اشاعت گزشتہ میں صفحہ ۲۸۵ پر تفسیر سورۂ رحمٰن میں آیات ۶۸-۶۹ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔ براہ کرم عبارت کو اس طرح درست کر لیں:

دونوں باغوں میں دو چشمے فوّاروں کی طرح اُبلتے ہوئے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ اُن میں بکثرت پھل اور کھجوریں اور انار۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟

شام کی حزبُ البعث

اس کی تاریخ، نظریات اور کارنامے

(خلیل حامدی)

اسرائیل اور عربوں کی تازہ جنگ کے جو حالات اور نتائج اخبارات میں آ رہے ہیں انہیں پڑھ کر ہر مُسلمان کا دل انتہائی غمگین ہے۔ ایک طرف مسلمانوں کے آبائی علاقے چھن گئے ہیں اور دوسری طرف ان کی آبادیاں اکھاڑی جا رہی ہیں اور ان کے معصوم بچوں اور عورتوں کو نشانۂ ستم بنایا جا رہا ہے۔ ان روح فرسا اور زہرہ گداز حوادث سے بے شک دنیا کا ہر مسلمان خون کے آنسو رو رہا ہے۔ اندلس کی بربادی، ترکستان کا ضیاع اور ازبکستان اور تاجکستان کی مسلم جمہوریتوں کا خاتمہ بے شک اسلامی تاریخ کے عبرت انگیز المیے ہیں۔ مگر ۵ جون ۱۹۶۷ء کا المیہ اس لحاظ سے گزشتہ تمام المیوں سے زیادہ پریشان کُن اور ہولناک ہے کہ اس کا نشانہ ملّتِ اسلامیہ کا قبلۂ اوّل بنا ہے جو تیسرا حرم ہے، گہوارۂ انبیاءؑ ہے، خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلّم کی معراج کی پہلی منزل ہے۔

یہ المیہ اپنے دامن میں جو نتائج و عواقب رکھتا ہے وہ پُوری ملّتِ اسلامی پر اثر انداز ہونے والے ہیں۔ اس لیے ہمیں نالہ و شیون اور آہ و فریاد سے ہٹ کر ٹھنڈے دل سے اُن اسباب کا جائزہ لینا چاہیے جو اس جنگ میں عربوں کی شکست اور مغضوب علیہ قوم کی فتح پر منتج ہوئے۔ اس جنگ کے دو فریقوں یعنی مصر اور اردن کے داخلی حالات سے تو کم و بیش لوگ واقف ہو چکے ہیں مگر اس کے تیسرے فریق شام کے داخلی حالات بہت کم لوگوں کے علم میں ہیں۔

شام پر اس وقت بعث پارٹی کی حکومت ہے۔ یہ پارٹی اگرچہ پہلے بھی حکومت میں شامل رہ چکی ہے مگر ۱۹۶۳ء سے تو کلّی طور پر اُس نے ملک کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے۔ اِن صفحات

پاکستان میں اس پر
ٹکٹ لگانے کی
ضرورت نہیں

کاروباری جوابی کارڈ

پرمٹ نمبر ۱۹۳

اس کارڈ کا
خرچ مکتوب الیہ
ادا کرے گا

ماہنامہ چراغِ راہ

یوسف منزل ہرمزجی اسٹریٹ کراچی ۱

میں چراغ راہ کے سوشلزم نمبر سے چراغ راہ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں مجھے سوشلزم نمبر بذریعہ وی پی (بارہ روپے پچاس پیسے بشمول ڈاک خرچ) بھیج دیا جائے -

نام

پتہ

مندرجہ ذیل پتوں پر سوشلزم نمبر کا تعارف بھیج دیا جائے

میں ہم اس پارٹی کے نظریات اور کارناموں کے متعلق ضروری معلومات دے رہے ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ کیا یہ پارٹی شامی عوام کے اندر روحِ جہاد پھونک سکتی تھی اور شامی قوم کو اسرائیل کے مقابلے پر لا سکتی تھی؟ اسلامی فتوحات کے بارے میں جب مورخین قلم اٹھاتے ہیں تو اسبابِ فتوحات کا جائزہ لیتے وقت وہ ایران اور اندلس اور روم و مصر کے داخلی حالات بیان کرتے ہیں، ان کے مذہبی تفرقوں، نظریاتی اختلافات اور حاکم گروہ کے معاشی اور اجتماعی مظالم کو اجاگر کرتے ہیں۔ اور اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان داخلی اسباب کی نقاب کشائی کریں جو اسلامی فتوحات میں ممدّ و معاون ثابت ہوئے۔ اسی طرح ہمیں جذبات اور وقتی تاثرات کے اس ہجوم میں نہایت ٹھنڈے دل سے حقائق و واقعات کی روشنی میں اُن اسباب کا مطالعہ کرنا چاہیے جو عربوں پر اسرائیل کی فتحیابی میں پنہاں ہیں۔

شام پر بعث پارٹی کا اقتدار مارچ ۶۳ء سے قائم ہے۔ اس پارٹی کے چار سالہ دورِ اقتدار کے حالات پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ وہ تاریخی پس منظر بیان کر دیا جائے جس میں نوبت اس پارٹی کے اقتدار تک پہنچی، کیونکہ ماضی کے ان مجموعی حالات کو حال کی صورت گری کرنے میں دخل حاصل ہے اور ان سے واقف ہوئے بغیر موجودہ صورتِ حال کو سمجھنا مشکل ہے۔

فرانسیسی استعمار کا دور | شام پر فرانسیسی استعمار کا قبضہ تقریباً ۲۴ سال رہا ہے۔ ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک تو تنہا فرانس نے اس پر حکومت کی ہے اور ۱۹۴۱ء کے بعد ۱۹۴۴ء تک فرانس اور برطانیہ دونوں نے مل کر وہاں رقصِ استبداد کیا ہے۔ فرانس نے شام کے اندر جو خطرناک ہتھکنڈے استعمال کیے اُن میں سے ایک یہ تھا کہ اُس نے ملک کے اندر مسلم اکثریت کو دبانے اور اقلیتوں کو اُبھارنے کی سیاست اختیار کی۔ شام کی ۴۰ لاکھ کی آبادی میں مسلمان غالب اکثریت میں تھے۔ اور دوسری تمام اقلیتیں چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں تھیں۔ بڑی اقلیتوں میں نمبر ایک عیسائی تھے، دوسرے نمبر پر نُصَیری (جنہیں فرانس نے علَویوں کا نام دے دیا تھا کہ اُس نفرت کو دُور کیا جائے جو نُصَیری کے نام سے مسلمانوں میں پائی جاتی تھی) اور تیسرے درجے پر دروزی۔ نُصَیری سوا دو لاکھ کے قریب تھے اور دروزی ایک لاکھ سے کم۔ شہری آبادیاں زیادہ تر مسلمان تھیں۔ نُصَیری لاذقیہ (دانطاکیہ) کے قریب ساحل پر آباد تھے اور دروزی

جبل الدروز کے علاقے میں رہتے تھے جو شام اور اُردن کی سرحد پر واقع ہے۔ اسی پہاڑ کی نسبت سے یہ دروزی کہلاتے ہیں۔ چرکس، ارمن اور یزیدی اقلیات بھی وہاں پائی جاتی ہیں مگر برائے نام۔ فرانسیسی استعمار نے ایک طرف مسلمانوں پر انتہائی ظلم و تشدد برتا اور انہیں پسماندہ رکھنے کی پوری کوشش کی۔ دوسری طرف اس نے ان اقلیتوں کے ساتھ بڑی شفقت کا رویہ اختیار کیا۔ سرکاری مشینری میں ان کو کلیدی مناصب دیئے۔ فوج میں ان کو زیادہ سے زیادہ داخل ہونے کا موقع دیا۔ اور ان کے دل میں مختلف ذریعوں سے مسلمانوں کے خلاف بغض بھرنے کی کوشش کی۔ مسلمان رہنماؤں نے فرانس کی اس سیاست کو بھانپ کر ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ان اقلیات سے قومی پیمانے پر تصادم نہ ہونے پائے۔ چنانچہ شام کی آزادی میں جن شامی رہنماؤں نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے ان میں اگر ایک طرف شکری القُوَّتلی (جمہوریہ شام کے پہلے صدر جن کا ابھی حال میں انتقال ہُوا ہے) اور ہاشم اتاسی جیسے جلیل القدر مسلمان ہیں تو دوسری طرف فارس الخوری جیسے محب وطن مسیحی بھی ہیں۔ بدرالدین حسینی جیسے مذہبی عالم بستی بستی اور شہر شہر گھوم کر فرانس کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لیے جہاد کی رُوح پھونکتے رہے اور اُن کی آواز سے مسلم و غیر مسلم سبھی متاثر ہوتے رہے۔

شام کی آزادی کے بعد جو حکومت قائم ہوئی وہ بے شبہ صحیح وطنی حکومت کہی جاسکتی ہے اس میں تمام عناصر نے کسی نہ کسی حیثیت میں حصّہ لیا۔ بلکہ مسلم اکثریت کے ملک میں فارس الخوری جیسے مسیحی لیڈر بھی وزارتِ عظمٰی کے مناصب پر فائز رہے۔ مگر فرانس کا ناپاک استعمار اس ملک کے اندر تفرقہ اور گروہ بندی اور نسلی عصبیت کے جو بیج بو گیا تھا وہ پرورش پا رہے تھے۔ بلکہ فرانس اپنے خفیہ ذرائع سے مسلسل ان کی آبیاری کر رہا تھا۔

آزادی کے بعد پے در پے انقلابات | شام کی بدقسمتی کا آغاز ۱۹۴۹ء سے ہوتا ہے جب ملک کی جمہوری اور پُرسکون زندگی فوجی آمریت کی گود میں چلی گئی اور شامی فوج کے کمانڈر انچیف حُسنی الزعیم نے تمام جمہوری ادارے ختم کر کے ملک میں فوجی حکومت کا اعلان کر دیا اور جنگِ آزادی کے تمام ہیرو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے کر دیئے گئے۔

کچھ ہی عرصہ بعد ایک اور فوجی کمانڈر سامی الحنّاوی نے اٹھ کر "قوم ہی کے نام سے" غدار حسنی الزعیم کے خلاف انقلاب برپا کر دیا اور حسنی الزعیم اور اس کا وزیر اعظم محمد محسن البرّازی دونوں گولی کا نشانہ بنا دیئے گئے۔ سامی الحنّاوی نے جمہوری ادارے بحال کرنے کی کوشش کی اور ملکی اختیارات وطن پرست عناصر کے سپرد کر دیئے۔

مگر فوج اختیارات اور حکمرانی کا مزہ پوری طرح چکھے بغیر رہنے والی نہ تھی۔ دسمبر ۱۹۴۹ء میں شامی فوج کے ایک کرنل ادیب ششکلی نے ملک پر فوجی یلغار کر دی اور اس کے پیش رو سامی الحنّاوی کو جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ اس پر الزام یہ تھا کہ وہ شام کو عراق کے ہاتھ بیچنا چاہتا تھا۔ آخر کار اُسے حسنی الزعیم کے وزیر اعظم محمد محسن البرّازی کے قتل کے الزام میں گولی کا نشانہ بننا پڑا۔ اب ادیب ششکلی کا دورِ حکومت تھا اس دور میں دسمبر ۱۹۴۹ء سے لے کر اکتوبر ۱۹۵۴ء تک شامی فوج دل بھر کر اہلِ شام کے سینے پر مونگ دلتی رہی۔ فوج اور سول کے بے شمار لوگ قتل کر دیئے گئے۔ استبداد و تشدّد کا خوب دور دورہ رہا۔ ملک کی اجتماعی اور اقتصادی زندگی ڈانواں ڈول ہو گئی۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا۔ قوم کے نام پر قوم کو ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی گئی۔ ادیب ششکلی نے فوج کے زیرِ سایہ پارلیمنٹ کا انتخابِ عام کروایا اور پارلیمنٹ کی طرف سے اُسے "صدرِ جمہوریہ" کا منصب بھی پیش کر دیا گیا۔ مگر شام کی تمام سیاسی اور اجتماعی اور مذہبی تنظیموں نے مل کر اس انتخاب کا مقاطعہ کیا اور متحدہ محاذ کی شکل میں ادیب ششکلی کی ڈکٹیٹر شپ کا مقابلہ کیا۔ فروری ۱۹۵۴ء کو حلب میں ششکلی کے خلاف بغاوت ہوئی اور شام سے بھاگ کر اُسے سعودی عرب میں پناہ لینی پڑی۔[1]

اس حال میں کہ ملکی معیشت کا ایک ایک بخیہ ادھڑ چکا تھا ادیب ششکلی سے ملک کو نجات ملی۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں پھر وطنی حکومت برسرِ اقتدار آئی۔ ڈاکٹر فارس الخوری اس کے وزیر اعظم تھے لیکن یہ حکومت بھی زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ فوجی گروہ بار بار اس میں دخل دیتے رہے۔ اسی دخل اندازی سے تنگ آکر فارس الخوری نے استعفا پیش کر دیا۔ حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ کسی دانشمند، وطن دوست اور تعلیم یافتہ شخص کے لیے انہیں سدھارنا مشکل تھا۔ ان حالات میں جو حکومتیں بھی بنتی رہیں اُن میں سے بمشکل ہی کسی حکومت نے ایک سال سے

---

[1] ۱۹۶۳ء میں ادیب ششکلی ایک نامعلوم شخص کے ہاتھوں یورپ میں گولی کا نشانہ بن گیا۔

زیادہ عرصہ کی عمر پائی ہو۔

ستمبر ۱۹۵۷ء میں شام اور مصر کے درمیان ایک فوجی معاہدہ طے ہوا اور بالآخر یکم فروری ۱۹۵۸ء کو شام اور مصر میں اتحاد ہو گیا۔ دونوں ملکوں نے مل کر "متحدہ عرب جمہوریہ" کو جنم دیا۔ مگر یہ اتحاد بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک ۹ سال کا عرصہ ایسا گزرا تھا جس نے شام کے استقرار کو ہمیشہ کے لیے خارج خطی کر دی تھی۔ اس استقرار کو ختم کرنے میں شام کی بعث پارٹی اور سوشلسٹ اور کمیونسٹ عناصر کو غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ ان عناصر نے فوج کے اُن عناصر کو بھی غلط راستے پر ڈال دیا جو اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ زیادہ تر اُن فوجی گروہوں نے یہ بغاوتیں کیں جو حماہ اور اس کی پہاڑیوں کے رہنے والے تھے۔ یہ وہی علاقے ہیں جن میں زیادہ تر نصیری فرقہ کے لوگ آباد ہیں۔ اسی لیے شامی مورخ اس دور کو حموی آمریت کا دور کہتے ہیں۔ مصر کے ساتھ شام کے الحاق کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ شام کے ملاحدہ اور بگڑے ہوئے فوجی عناصر شام کو خالص کمیونسٹ اسٹیٹ میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ شامی فوج میں باہم سخت کشمکش شروع ہو گئی تھی اور ملک شدید خطرے سے دوچار ہو گیا تھا۔ اس لیے شام کے مخالف اشتراکیت حلقوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ مصر سے الحاق قائم کر لیا جائے۔ کیونکہ مصر اُس وقت مکمل کر روسی بلاک کا "یارِ غار" بن کر سامنے نہیں آیا تھا۔ مگر اتحاد کے چند روز ہی بعد قاہرہ نے پھر ان فوجی عناصر کی پشت پناہی شروع کر دی جن سے نجات پانے کے لیے شامی عوام نے یہ اتحاد قائم کیا تھا۔

شام اور مصر کا اتحاد فروری ۱۹۵۸ء سے لے کر ستمبر ۱۹۶۱ء تک شام اور مصر کا اتحاد قائم رہا۔ بلکہ صحیح لفظوں میں شام پر مصر کی حکمرانی رہی۔ اس دور میں شام کی صوبائی حکومت کی باگ ڈور بعث پارٹی کے لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ اتحاد کے اس دور میں قاہرہ اور بعث پارٹی نے مل کر شامی قوم کے ساتھ جو سلوک کیا وہ یہ ہے:

شام میں عارضی دستور نافذ کیا گیا۔ اس دستور کے تحت تمام انتظامی اور تشریعی اختیارات صدر کو دے دیئے گئے[1] اور بالآخر شام پر مستقل آمریت کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ اعلان صدر کے آرڈی ننس

---

[1] کتاب "ماذا یجری فی سوریہ" تالیف نزار عرابی۔ طبع دار الفکر دمشق۔ صفحہ ۹۴ تا ۹۹۔

ایکٹ نمبر ۱۶۲ ، ۴ ، ۱ مجریہ ۱۹۵۸ء کے ذریعہ ہوا۔ اس اعلان کے تحت صدر اور نائب صدر کو یہ اختیارات دیئے گئے :

"اجتماع ، نقل و حرکت ، اقامت ، مخصوص جگہوں پر مخصوص اوقات میں آمد و رفت کی آزادی پر پابندی ۔ مشکوک اشخاص کو گرفتار کرنے کا حق ۔ امن و امان اور ملکی نظام کے لیے خطرہ پیدا کرنے والے افراد کی نظر بندی ۔ عدالتی کارروائی کے بغیر اشخاص اور مقامات کی تفتیش کی اجازت کسی بھی شخص کو کسی بھی کام کے سرانجام دینے پر مجبور کرنا ۔ رسائل و اخبارات کا سنسر ، ان کی ضبطی چھاپے خانے کی ضبطی ۔ دکانوں اور منڈیوں کو کھولنے اور بند کرنے کے اوقات کا تعین ۔ منقولہ اور غیر منقولہ جائداد پر قبضہ کے اختیارات[1] "

اس کے نتیجے میں پولیس ہی ملک کی اصل حکمران بن گئی ۔ پولیس کا ادارہ معاشرے اور قانون سے بالاتر ہو گیا[2] پولیس نے امن قائم کرنے کے بجائے ہنگامے اور فسادات کروانے شروع کر دیئے ۔ مزدوروں کے حلقوں اور "الاتحاد القومی" کے اندر بھی پولیس نے ہنگامے کھڑے کیے[3] زرعی اصلاحات کے نام سے آتشِ انتقام بجھائی گئی[4] قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا ۔ اس کے نتیجے میں لوگوں نے ملک کو خیر باد کہنا شروع کر دیا ۔ بعث پارٹی کی ان دھاندلیوں سے خود جمال عبدالناصر جیسا ڈکٹیٹر بھی انگشت بدنداں رہ گیا ۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو اس نے اسکندریہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا :

---

[1] ایضاً ص ۱۱۱ ۔ [2] کتاب " ما الذی جری فی سوریہ " تالیف محمد حسنین ہیکل ایڈیٹر الاہرام ص ۲۰۵ ۔

[3] ایضاً ص ۱۱۵

[4] محمد حسنین لکھتا ہے : " حلب کے ایک زمیندار رشاد الجابری کی زمین زرعی اصلاحات کے قانون کے تحت تقسیم کی گئی ۔ اس قانون کی رو سے مالک کو اپنی زمین میں سے ایک محدود مقدار اپنی مرضی کے مطابق منتخب کر لینے کا حق تھا مگر وزیر زراعت مصطفیٰ حمدون نے اسے یہ حق استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی ۔ اور جب مصطفیٰ حمدون سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے کہا کہ " یہ شخص بغداد پیکٹ کا حامی ہے " ملاحظہ ہو کتاب ما الذی جری فی سوریہ ص ۹۷ ۔ ۹۸ ۔

"بعث پارٹی حکومت پر ہرگز نہ آسکتی تھی۔ اس پارٹی نے تباہ کن وسائل کے ساتھ تشدّد کا راستہ اختیار کیا۔ خونریزی کو مشغلہ بنایا۔ بعث کا نظام فاشسٹ نظام ہے۔ یہ عوام کی نمائندگی سے محروم ہے۔ بعث حکومت کی بنیاد خونریزی، تشدّد اور جیل خانوں پر قائم ہے[1]..."

اس دور میں بعث پارٹی کی حکومت نے ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا جس سے بہ بخوبی اندازہ ہوگیا کہ مسلمانوں کے حق میں اس پارٹی کے کیا عزائم ہیں۔ یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کی ایک تعداد وہاں کی کمیونسٹ حکومت کے مظالم سے تنگ آکر شام میں پناہ گزین تھی۔ ۱۹۴۹ء کی جنگ فلسطین میں ان مسلمانوں نے بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا اور کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ۱۹۵۹ء میں جب مارشل ٹیٹو نے متحدہ عرب جمہوریہ کا دورہ کیا تو اُس نے ان پناہ گزین مسلمانوں کو واپس یوگوسلاویہ بھیجنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ بعث حکومت نے یہ تمام مسلمان خفیہ پولیس کے حوالے کردیئے۔ لاذقیہ کی بندرگاہ سے ان کو بحری جہاز میں لاد دیا گیا اور وہاں سے یہ یوگوسلاویہ پہنچا دیئے گئے۔ یوگوسلاویہ میں انہیں یک قلم موت کے گھاٹ اتار دیا گیا[2]۔

اتحاد کا خاتمہ بعثی اور اشتراکی عناصر کی دھاندلیوں اور قاہرہ کی بے تدبیریوں کی وجہ سے مصر اور شام کا اتحاد ۳ سال ۷ ماہ کے اندر ختم ہوگیا۔ حماہ کے ایک فوجی نوجوان حیدر الکزبری نے شام کو مصر سے کاٹ دیا اور مصریوں کو ملک سے نکال دیا۔ شام کے ایک ایک فرد نے اس اتحاد کے انقطاع پر خوشی کے شادیانے بجائے۔ ملک کے اندر سول حکومت قائم کردی گئی۔ اجتماعی اور اقتصادی زندگی میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ علیحدگی کے تھوڑے عرصہ بعد پارلیمنٹ کا انتخاب عمل میں آگیا۔ ناظم القدسی جیسے مرنجاں مرنج لیڈر سربراہ منتخب ہوئے۔ نئے دستور کی تدوین کا آغاز ہوگیا۔ لیکن وہ عنصر جو جمہوری ماحول

---

[1] سقوط الثورات الاشتراکیہ ص ۱۳۳-۱۳۵

[2] کتاب: سقوط الثوراتِ الاشتراکیہ، مطبوعہ لبنان ص ۱۱۹-۱۲۰۔ نیز ملاحظہ ہو: ماہنامہ حضارۃ الاسلام، دمشق، شمارہ نومبر ۱۹۶۲ء و روزنامہ الندوہ، مکہ بیان محمود کمال مفتیش۔ البتہ مارشل ٹیٹو نے پچاس ہزار یہودی اسرائیل بھیجے ہیں جن میں اس کا بھائی ماحوم بیادہ بھی ہے اور وہ وزارتِ خارجہ میں اہم عہدے پر کام کر رہا ہے۔

میں اپنی موت سمجھتا ہے اس نئے دور سے ناخوش تھا۔ کیونکہ جمہوری انتخاب نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ تمام نعرے جو بعث ازم نیشنلزم اور کمیونزم کے نام پر لگائے گئے ہیں اور انہیں "پسماندہ عوام" کے مقبول ترین نعرے قرار دیا جاتا رہا ہے، عوام نے ان سے بیزاری کا اظہار کر دیا ہے اور آزادانہ انتخاب کے پہلے ہی مرحلے میں اُن کی قلعی کھل گئی ہے۔ چنانچہ چند طالع آزما لیڈروں نے فوج کے اُن افسروں سے راہ و رسم پیدا کی جو خود حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس طرح سے شام پھر ایک اور تاریک شام کا استقبال کرنے لگا۔ اس کے بعد حالات میں جو تغیر ہوا اُس کا خلاصہ یہ ہے :

پے در پے فوجی انقلابات ۲۸ مارچ ۱۹۶۲ء کو تین فوجی افسروں، عبدالکریم نحلاوی، مہیب الہندی اور ہشام نے مل کر دمشق پر ٹینکوں سے چڑھائی کر دی۔ ان میں ایک دستہ وہ تھا جو اسرائیلی سرحد پر متعین تھا۔ ان افسروں کی یہ تحریک، جس کے پیچھے بعثی اور اشتراکی سول افسروں کا بھی ہاتھ تھا اس لحاظ سے انتہائی تباہ کن تھی کہ شام جمہوریت کے راستے سے ہٹ کر پھر عسکری آمریت کے پنجے میں جا رہا تھا۔ انقلابیوں نے تمام سیاستدانوں کو المزہ کی جیل میں ڈال دیا۔ اور نہاد القاسم نے نئی مخلوط وزارت تشکیل کی جس میں فوج اور سول کے وزراء شامل کیے گئے۔

ابھی اس حکومت نے "ہنی مون" بھی نہ منایا تھا کہ دو ہفتے کے بعد جاسم علوان اور لوئی اتاسی اور اُن کے رفقاء نے بغاوت کر دی۔ شام کے شمالی علاقے سے یہ تحریک اٹھی، ناصر حامیوں نے اسکی تائید کی اور وحدت مصر شام کو نئے سرے سے بحال کرنے کی کوشش کی گئی۔ بشیر العظمہ کی حکومت نے بالفعل اس کا اعلان بھی کر دیا مگر دمشق اور قاہرہ کی گفتگوئیں نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئیں۔ قاہرہ نے سرد مہری کا برتاؤ کیا۔ عبدالکریم نحلاوی اور اس کے ساتھی ملک سے باہر نکال دیئے گئے اور ابھی تک وہ جلا وطن ہیں۔ ملک کے اندر خلفشار نے تباہ کن صورت اختیار کر لی۔

ملک کی کشتی کو بھنور کے بیچوں بیچ دیکھ کر سابقہ پارلیمنٹ نے خود بڑھ کر ہمت کی۔ مرحوم خالد العظم کے مکان پر اس کا اجلاس ہوا۔ پارلیمنٹ نے خالد العظم پر اعتماد کا اظہار کیا اور ان کی سرکردگی میں نئی حکومت کی تشکیل کر دی گئی۔ نئے دستور کی تدوین پر وقت صرف کرنے کے بجائے ۱۹۵۰ء کے

دستور کو نافذ کر دیا گیا۔ یہ وہی جمہوری دستور تھا جسے وطن پرست عناصر نے فرانس سے نجات کے بعد وضع کیا تھا اور شام کے پہلے فوجی ڈکٹیٹر حسنی الزعیم نے جسے بوٹوں تلے روند ڈالا تھا۔ ایمر جنسی ختم کر دی گئی۔ بنیادی آزادیاں بحال کر دی گئیں۔ مگر ماحول کی خوشگواری سے فائدہ اٹھا کر شر پسند عناصر نے فتنہ پردازی شروع کر دی۔ بازاروں اور شاہراہوں پر بم پھینکے گئے۔ فضا کو معمول سے ہٹانے کے لیے جگہ جگہ دہشت پسندانہ سرگرمیوں کا آغاز کر دیا گیا۔ شام کے تمام اہلِ علم، اربابِ سیاست اور مذہبی اور سوشل تنظیموں کے لیڈر اس امر پر متفق تھے کہ ملک کو کسی نہ کسی طرح آمریت کی طرف جانے سے بچایا جائے۔ اکرم حورانی جیسے اشتراکیت نواز بھی اس میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ ایک نیشنل چارٹر وضع کیا گیا جس میں ملک کے ہر حلقے کی نمائندگی تھی۔ ۸ مارچ ۱۹۶۳ء کو شام ریڈیو سے اس چارٹر کا اعلان ہونے والا تھا۔

بعث پارٹی کی حکومت ٹھیک ۸ مارچ ۱۹۶۳ء کی صبح کو ایک فوجی افسر زیاد الحریری کی قیادت میں ایک اور فوجی انقلاب برپا کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ قاہرہ کے حامیوں نے اس انقلاب کا تانا بانا تیار کیا تھا مگر زیاد الحریری اور فوج کے بعثی عناصر اسے لے اڑے۔ شروع میں انقلابی حکومت میں ناصریوں کو بھی شامل کیا گیا۔ مگر رفتہ رفتہ بعثی گروہ نے جو دروزیوں اور علویوں پر مشتمل تھا، تمام ناصریوں کو نکال دیا اور خالص بعثی حکومت کا طوطی بولنے لگا۔ شام کے اندر اس دور میں سخت افسوسناک حالات رونما ہوئے۔ بعثی کارکنوں نے عوام الناس پر دست درازیاں کیں۔ دمشق اور حماۃ اور حمص میں سینکڑوں افراد شہید کیے گئے۔ مسلمانوں نے اقلیتی فرقے کی حکومت کے خلاف احتجاج کیا۔ مسجدوں اور عبادتگاہوں میں اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ مگر بعث کی فوجی حکومت نے دل کی پوری بھڑاس نکالی۔ دمشق کی مشہور تاریخی مسجد جامع اموی پر گولہ باری کی اور عین حالتِ نماز میں نمازیوں کو شہید کیا۔ حماۃ کی جامع مسجد میں بھی جب مسلمانوں نے پناہ لی تو فوج نے مسجد کے اندر گھس کر لوگوں کو پکڑا اور انہیں سرِ بازار سزائیں دیں۔ اسلام پسند عناصر کے ساتھ انتہائی وحشیانہ برتاؤ کیا۔ ان کی ڈاڑھیاں نوچی گئیں، ناخن اکھاڑے گئے اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ سیاسی بے دخلی بھی شروع ہو گئی۔ سیاستدانوں کی فہرستیں باہر سے چھپ کر آتی

تھیں اور شام میں ان پر عمل درآمد ہوتا تھا۔

اس طرح بعث پارٹی کی حکومت کا دور مارچ ۱۹۶۳ء سے شروع ہوا۔ اس پارٹی نے آج تک جو مہمات سرانجام دی ہیں اُن کا جائزہ لینے سے پہلے اس پارٹی کی تاریخ، اس کے نظریات اور اس کے بعض لیڈروں کا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بعث پارٹی کا بانی | بعث پارٹی ۱۹۴۰ء میں وجود میں آئی تھی۔ اس نے اپنے چھبیس سالہ دور میں اسلام کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں اٹھا رکھی۔ عرب قوم پرستی، الحاد اور اشتراکیت کی آڑ میں اس نے الحاد اور زنادقہ کی اشاعت کی ہے۔ اس پارٹی کا بانی ایک عیسائی مائیکل عفلق[1] ہے۔ یہ شخص ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک فرانس میں تعلیم حاصل کرتا رہا ہے۔ شام کی فرانسیسی حکومت نے اسے خاص طور پر تعلیمی مشن کے ہمراہ بھیجا تھا۔ فرانس سے واپس آیا تو اسے دمشق کے مدرسۃ التجہیز الاولیٰ میں اسلامی تاریخ کا مدرس مقرر کیا گیا۔ یہ مدرسہ ثانوی تعلیم کے معیار کا تھا۔ تدریس کے زمانے میں اس نے طلبہ کے اندر اپنے بیہودہ نظریات و افکار کی اشاعت شروع کر دی اور ان کے ذہنوں میں یہ نظریہ اُتارنا شروع کر دیا کہ: اسلام خالصتہً عربوں کی تحریک تھی۔ غیر عربوں نے اس میں شامل ہو کر اسے بگاڑ دیا ہے۔ اسلام کے مخالفین جنہیں مشرکین عرب کہا جاتا ہے محض اپوزیشن لیڈر تھے۔ انہوں نے بھی اس تحریک کی کامیابی کے لیے اتنا ہی حصہ لیا جتنا اس تحریک کی موافق پارٹی نے لیا۔ اور یہ کہ جو قرآن عثمان رضی اللہ عنہ نے جمع کیا ہے وہ اُس قرآن سے مختلف ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا[2]۔ علمائے اسلام کے کانوں تک جب یہ ہفوات پہنچیں تو انہوں نے وزارتِ تعلیم سے سخت احتجاج کیا جس کے نتیجے میں وزیرِ تعلیم نے فوری کارروائی کی اور تاریخ اسلامی کے بجائے اس شخص کو فرانسیسی زبان کی تعلیم کا استاد بنا دیا گیا۔ مذکورۂ بالا مدرسہ دمشق کا وہ واحد مدرسہ تھا جو فرانسیسی تسلط کے اثر سے آزاد تھا۔ اس مدرسے میں شام کے نمایاں لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مائیکل عفلق نے

---

[1] ہمارے ملک کے اخبارات عموماً اس کو افلاک لکھتے ہیں۔ حالانکہ اس کا صحیح نام عفلق ہے۔

[2] باطنیہ کی ہر تحریک نے اپنے زمانے میں یہی خیال پیش کیا ہے کہ موجودہ قرآن اصل قرآن نہیں ہے۔ اصل قرآن باطنیہ کے سینوں میں ہے۔

اس مدرسہ کے نوخیز ذہن کو اپنی آماجگاہ بنائے رکھا طلبہ کو فرانس میں تعلیم کی سہولتیں دلوانے کا لالچ دے کر اپنے جال میں پھنساتا رہا اور ان کے اندر دینی روایات کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھارتا رہا۔ اور بعض اچھے اچھے دینی گھرانوں کے نوجوانوں کو بھی اُس نے اپنے خیالات سے متاثر کر لیا۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں مائیکل عفلق نے مدرسی سے استعفا دے دیا اور اپنی پارٹی کی تنظیم شروع کر دی۔ ۱۹۴۹ء میں جب حُسنی الزعیم نے پہلی مرتبہ شام کے اندر فوجی آمریت قائم کی تو مائیکل عفلق کو وزارتِ تعلیم کا قلمدان سونپا گیا۔ چنانچہ اس منصب سے اُس نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اپنے کئی پیروکاروں کو تعلیم کے لیے فرانس بھجوایا۔ اس کے حامیوں نے تعلیمی اداروں کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور اپنے مدرسین کو مختلف اسکولوں میں پھیلا دیا۔ شام کے کالج آف ایجوکیشن اور ٹیچرز ٹریننگ سنٹر انہوں نے کلیتہً اپنے قبضہ میں لے لیے۔ اور حالت یہ ہو گئی کہ ہر اُس طالبِ علم کے لیے انہوں نے اِن اداروں کے دروازے بند کر دیئے جس کے اندر سے ایمان باللہ اور اسلام سے وابستگی کی بُو آتی تھی۔ اِسی طرح ملٹری کالج پر بھی ان کا مکمل تسلط ہو گیا اور وہاں بھی کسی مومن کے لیے داخلے کی گنجائش انہوں نے نہ چھوڑی۔ البتہ غیر مسلم اقلیتوں کے افراد، اور علوی اور دروزی اور وہ مسلمان نوجوان جنہوں نے اسلام اور عقیدۂ اسلام کو فارغ خطی لکھ دی، اِن اداروں سے خوب فائدہ اٹھاتے رہے۔ ان سے فارغ ہو کر جو نوجوان نکلے ان میں سے اکثر و بیشتر عفلق کے نظریات کے پُرجوش داعی بن نکلے۔ یہ اُسی دَور کا قصہ ہے کہ کالج آف ایجوکیشن کے طلبہ کے ایک گروہ نے (نعوذ باللہ) خدا کا جنازہ نکالا تھا۔ اور ابوجہل اور ابولہب کے نام سے تفریحی کلب قائم کیے تھے۔

مائیکل عفلق نے اسلام کے بارے میں جو رویّہ اختیار کیا وہ اس کی ان تحریروں سے واضح ہے جو آگے ہم نقل کر رہے ہیں۔ لیکن خود مسیحیت میں اُس کی پُختہ زناری کا یہ عالم رہا کہ اس نے باقاعدہ ویٹیکن میں حاضر ہو کر پوپ کی زیارت کی اور اس سے ایک تمغہ حاصل کیا۔ فرانسیسی گورنر سے بھی (جو اُس وقت شام اور لبنان کے دونوں صوبوں کا گورنر تھا) اس کے گہرے روابط تھے۔ گورنر کا مرکز بیروت میں تھا۔ ایک مسلمان فوجی افسر جسے فرانسیسی عہد میں غیر معمولی منصب حاصل تھا اور جو فرانسیسی گورنر کے محل میں تعینات تھا، بیان کرتا ہے کہ اس زمانے میں عفلق اور فرانسیسی گورنر کے درمیان طویل خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور ان

ملاقاتوں میں نہایت اہم امور پر مشورے ہوتے رہتے تھے[1]

بعث پارٹی کے اصل حامی | مسلمان طلبہ کے اندر مائیکل عفلق کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوسکی۔ بے شک اُس نے بعض اچھے مذہبی گھرانوں کے نوجوانوں کو خراب کیا لیکن علماء کے واویلا اور احتجاج کی بنا پر اس نے اپنی دعوت کا رُخ بدل دیا اور صرف اقلیتی فرقوں کے طلبہ پر اپنی توجہات مرکوز کردیں۔ وزارتِ تعلیم سے مستعفی ہوکر اُس نے پارٹی کی توسیع کے لیے دروزی قبائل اور نصیری، یعنی علوی آبادیوں کا دورہ کیا۔ یہ دونوں قبائل قریب قریب یکساں عقائد رکھتے ہیں اور مسلمانوں کی عداوت پر متفق ہیں۔ فرانس نے اپنے دورِ انتداب میں اِن فرقوں کو مسلمانوں کے خلاف اُبھارنے کی پُوری کوشش کی ہے[2] مائیکل عفلق نے اسی عصبیت سے فائدہ اٹھاکر ان دونوں فرقوں کے لیے بعث پارٹی کے دروازے کھول دیئے اور ان کے ذریعے سے شامی فوج کے اندر اپنے خفیہ حلقے قائم کرلیے۔ ہمارے ملک کے بعض لوگ بعث پارٹی کو مسلمانوں کی کوئی جماعت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس پارٹی کی زمامِ کار عیسائیوں، دروزیوں اور نصیریوں کے ہاتھ میں ہے۔ البتہ چند ملحد مسلمان ضرور اس میں شامل ہیں۔ مگر ان کی حیثیت دوسرے درجہ کی ہے محض مسلم دنیا کو دھوکا دینے کے لیے انہیں چند سرکاری منصب سونپے گئے ہیں[3]۔

نُصَیری اور دُروزی ہمیشہ مسلمانوں سے شدید عداوت برتتے رہے ہیں۔ صلیبی جنگوں میں انہوں نے عیسائیوں کی پُوری پوری مدد کی۔ صلیبی لشکر کو شام کے ساحلی علاقوں میں گھُسنے کا انہوں نے نہ صرف موقع دیا بلکہ پُوری رہنمائی کی۔ تاتاری بھی انہی کی امداد سے بلادِ اسلام میں داخل ہوئے۔ بلادِ اسلام پر یہ حملہ آوروں کی جاسوسی کرتے رہے۔ بحرین پر جب ان کو اقتدار حاصل ہُوا تو اس وقت بھی انہوں نے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں اور حج کے ایّام میں مکہ معظمہ پہنچ کر انہوں نے حجاج کی کثیر تعداد کو قتل کیا

---

[1] ملاحظہ ہو ہفت روزہ: اخبار العالم الاسلامی، مکہ، شمارہ ۵ رجون ۱۹۶۷ء۔

[2] کتاب "فی سبیل البعث" از مائیکل عفلق ص ۷۔

[3] بھارت کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کی جو پوزیشن ہندوستان میں ہے وہی پوزیشن ان چند مسلمانوں کی ہے جن کے نام بعث پارٹی اور بعث حکومت کی فہرست میں کبھی کبھار نظر آجاتے ہیں۔

اور انہیں چاہِ زمزم میں پھینک دیا۔ حجرِ اسود کو توڑ ڈالا۔ علمائے اسلام اور مسلمانوں کی نمایاں شخصیتوں کی اَن گنت تعداد ان کے ہاتھوں شہید ہوئی۔ اور اب نئے دورِ اقتدار میں انہوں نے مسلمانوں کے کشت و خون اور سلب و نہب میں پچھلے تمام ریکارڈ مات کر دیئے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں جو مسلمان فلسطین سے ہجرت کر کے نکلے تھے ان کا بیان ہے کہ اسرائیلی فوج کے یہودیوں نے ان پر وہ مظالم نہیں ڈھائے جو دروزیوں نے ڈھائے۔ دروزیوں کی تازہ ترین غداری عربوں اور اسرائیل کی حالیہ جنگ میں بھی ثابت ہو چکی ہے۔ روزنامہ جنگ میں محمود احمد مدنی لکھتے ہیں:

"شام کی تیز رفتار پسپائی کا ایک المناک پہلو یہ ہے کہ عین جنگ کے دوران اسرائیل سے متصل شام کی سرحد پر آباد دروزی قبائل نے اسرائیل سے وفاداری کا اعلان کر دیا۔ دروز شام کی ایک اہم اقلیت ہیں۔ شام کی خانہ جنگیوں میں ان کا ہمیشہ ہاتھ رہا ہے[1]"۔

بہر حال یہی دروزی اور علوی (نصیری) شام کی بعث پارٹی کے روحِ رواں رہے ہیں۔ انہی کی ریشہ دوانیوں سے وہاں جمہوریت نہیں چل سکی اور بار بار انقلابات برپا ہوتے رہے۔

بعث کے نظریات: اب ہم مائیکل عفلق اور بعث پارٹی کے دوسرے لیڈروں کی تحریروں کی روشنی میں اس پارٹی کے نظریات کا جائزہ لیتے ہیں۔ مائیکل عفلق نے بعث کے تین مقاصد بیان کیے ہیں، وحدت، حریت اور اشتراکیت۔ وحدت کا مفہوم وہ یہ بتاتا ہے کہ "عربوں کی مذہبی اور ملی اساسات کو ختم کر کے انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا[2]"۔ حریت کا مفہوم یہ ہے کہ "اسلام محض ایک مذہب ہے اس میں اور دوسرے مذاہب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عرب ریاست کے اندر ہر شہری کو عقیدہ کی آزادی ہوگی[3]"۔ اشتراکیت کا تصور یہ ہے کہ "میری اشتراکیت یہ نہیں ہے کہ کارخانوں میں اضافہ ہو۔ میری اشتراکیت یہ ہے کہ "زندگی کی دولت" میں اضافہ ہو۔ اصل بات یہ نہیں ہے کہ لوگ طعام میں مساوی ہوں۔ اصل چیز یہ ہے کہ

---

[1] ملاحظہ ہو روزنامہ جنگ بابت ۲۰ جون ۱۹۶۷ء مکتوب محمود احمد مدنی

[2] کتاب: فی سبیل البعث تالیف مائیکل عفلق ص ۲۴۱

[3] ایضاً ص ۲۴۱

ہر فرد اپنے خیالات و افکار کے اظہار میں مکمل آزاد ہو۔[1] اس اشتراکیت کے عزائم وہ یہ بتاتا ہے کہ "وہ ان "کمزور انسانوں کی کایا پلٹنے والی ہے جو مصائب کا مقابلہ آہ و بکا سے کرتے ہیں اور یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ"۔[2] اشتراکیت کے نفاذ کا طریقہ اس کے نزدیک یہ ہے کہ "ہم اشتراکیت کو کیسے نافذ کریں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شام کی حکومت پر جب ہمارا قبضہ ہو جائے گا تو ہم تمام تفریقوں کو مٹا دیں گے اور عدل کو بروئے کار لائیں گے لیکن بایں ہمہ ہم باقیماندہ مشن کی تکمیل میں مصروف رہیں گے۔ ہو سکتا ہے ہم شامی قوم کی ہر خواہش پوری نہ کر سکیں۔ بلکہ ہم اس کی ضروریات میں سے کچھ تو وصول ہی کریں گے تاکہ فوج کی پرورش کر سکیں اور تمام عرب ملکوں کے اندر انقلاب برپا کر سکیں"۔[3] "اس کشمکش سے اس وقت تک کوئی جوہری انقلاب برپا نہیں ہوگا جب تک اس کی بھاری قیمت نہ ادا کی جائے"۔[4]

اسلام کے بارے میں بعث کا تصور بعث پارٹی کے بانی نے اسلام کو عربوں کی تحریک قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عرب لیڈر قرار دیا ہے۔ اور اسلام کو آسمانی پیغام نہیں بلکہ عربوں کی طبعی بیداری سے تعبیر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے:

"اسلام کی تحریک عربوں کے مزاج اور طبیعت کا عکس ہے اس لحاظ سے اسلام کی نزوت اور شعیں چاہے نہ بدلیں مگر اسلام کی روح بدلتی رہتی ہے۔ اب تک تو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کو باہر سے دیکھا گیا ہے اور ایک خوشنما شکل سامنے رکھی گئی ہے اور تقدیس اور تبجیل کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن اب ہمیں اندر سے بھی دیکھنا چاہیے"۔[5]

"اسلام کا کارنامہ اس طبعی اسٹیج سے الگ نہیں کیا جا سکتا جس پر یہ ظہور پذیر ہوا ہے، اور وہ اسٹیج ہے سرزمین عرب۔ اور نہ اس کارنامے کے ہیرو اور ایکٹر اس سے الگ کیے جا سکتے ہیں،

---

[1] ایضاً ص ۲۱ [2] ایضاً ص ۱۸

[3] ایضاً ص ۹۹ [4] ایضاً ص ۱۱۰

[5] گویا یہ باطنیت کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

اور وہ ہیں تمام عرب۔ اس کارنامے کے لیے جس طرح مومنین کی ضرورت تھی اسی طرح مشرکین عرب کی بھی ضرورت تھی۔ بظاہر اسلام سے جن لوگوں نے محاربہ کیا ہے دراصل انہوں نے اس کارنامے کو کامیاب کرنے میں اتنا ہی حصّہ لیا ہے جتنا اُس کے حامیوں اور مددگاروں نے لیا۔۔۔ لہٰذا اسلام ایک عرب قومیت کی تحریک تھی۔ اس کا مقصد عرب قومیّت (عروبہ) کی تجدید و تکمیل تھی۔ چنانچہ اسلام کی زبان عربی ہے، اور حالات کے بارے میں اسلام کا مطالعہ عربی ذہن کی عینک سے تھا۔ اسلام نے جن فضائل اور اوصاف کو بیان کیا ہے وہ سب عربوں کے فضائل اور اوصاف تھے۔ جس طرح ہم آج بعض افراد کو "وطن پرست" اور "قوم پرست" کہتے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ افراد اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو وطن اور قوم کے لیے کام کررہا ہے اسی طرح اُس زمانے میں مسلم اُس عربی کو کہتے تھے جو عرب قومیت کی اس تحریک سے وابستہ تھا۔[1]

عرب قومیت کے بارے میں بعث کا نقطۂ نظر مائیکل عفلق لکھتا ہے:

"عرب قوم بیدار ہو رہی تھی کہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔ بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت عربوں کے اندر جو بیداری کی رو چلی تو اسلام نے فقط اُسی بیداری کو بیان کیا ہے۔ اس لیے اسلام عرب قوم کے سوا کسی دوسری قوم میں عکس پذیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسلام عربوں کی خوبیوں، عربوں کے اخلاق اور عربوں کی صلاحیتوں سے عبارت ہے۔ لہٰذا اسلام یہی ہے کہ عرب طاقتور ہوں اور حکمرانی ان کے ہاتھ میں ہو۔ اسلام کی طاقت آج نئے مظہر میں وارد ہو رہی ہے اور وہ ہے عرب قومیت[2]۔"

"یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم نماز بھی پڑھیں اور روزے بھی رکھیں۔ لیکن ہم اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہمارا اسلام موروثی یا تقلیدی نہیں ہے بلکہ ترقی پسند ہے[3]۔"

عرب تحریک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے عفلق لکھتا ہے:

---

[1] "فی سبیل البعث" ص ۴۵ و ۴۶ [2] ایضاً ص ۴۳ و ۴۸

[3] ایضاً ص ۵۲۔

"عرب قوم نے متعدد اوقات میں مختلف طریقوں سے اپنی زندگی اور ذات کا اظہار کیا ہے کبھی حمورابی کے قانون کی شکل میں، کبھی جاہلی شاعری کے رنگ میں، کبھی دینِ محمد کے اندر، کبھی عہدِ مامون کے کلچر میں۔ ان تمام شکلوں میں احساس اور شعور ایک ہی رہا ہے اگرچہ زمانے مختلف رہے ہیں۔ عرب قوم کی حالیہ بیداری اور ترقی آج ہی کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کے رشتے ہزارہا سال پہلے کی تاریخ سے وابستہ ہیں"

"بعث کا نظریہ کبھی کبھی ماضی کا قصہ بھی چھیڑ دیتا ہے لیکن اُسے ماضی میں کوئی کمال نظر نہیں آتا ماضی ایک مرحلہ تھا جو واپس نہیں آسکتا اور نہ لایا جاسکتا ہے۔ بعث پارٹی کسی مخصوص نظریے کی علمبردار نہیں ہے نہ کسی مصنوعی خیال کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے"[1]

"عرب قوم آج وسیع تہذیبی میراث کی مالک ہے۔ اس میراث میں کئی تہذیبیں شامل ہو چکی ہیں اور باہم اثر انداز ہو چکی ہیں مصری تہذیب، آشوری تہذیب، فینقی تہذیب سب اس میں شامل ہیں۔ جب ہم عرب قومیت کا نام لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم فراعنہ کی تہذیب اور میراث کا انکار کرتے ہیں یا اس سے برات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ سطحی اندازِ فکر ہے۔ عرب قومیت کسی بھی انسانی تہذیب سے الگ چیز نہیں بلکہ تمام تہذیبوں کا مرکب ہے"[2]

عفلق کی نظر میں دین کی حقیقت دین کے بارے میں عفلق کے خیالات ملاحظہ ہوں:

"مشکل یہ ہے کہ دین کی حقیقت اور دین کے ظاہر میں فرق ہے۔ اس لیے کہ دین کا ایک باطن ہوتا ہے اور ایک ظاہر۔ اور بعض اوقات یہ فرق باطن اور ظاہر میں تناقض کی حد تک پہنچ جاتا ہے"[3]

اسرائیل کے متعلق اس کا نقطۂ نظر اسرائیل کے بارے میں عفلق کہتا ہے: "اسرائیل کا وجود ایک نفس الامری حقیقت ہے ہمیں اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔ فنی قابلیت کے لحاظ سے اسرائیل ترقی یافتہ ریاست ہے۔ اس کے مقابلے میں عرب معاشرہ پسماندہ ہے اور اس پر رجعت پسندوں کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اس چیز نے اسرائیل کو اس علاقے کی ترقی یافتہ ترین ریاست بنا دیا ہے چنانچہ وہ اب مشرق کے اندر مغرب کی تہذیب کا نیا تجربہ کر رہا ہے۔ یہ تجربہ حوصلہ افزائی اور تحفظ کا مستحق ہے"[4] (باقی)

---

[1] ایضاً ۱۸۰ [2] ایضاً ۲۱۴ [3] ایضاً ص ۲۰۰۔ عفلق کا یہ نظریہ بعینہٖ وہی نظریہ ہے جو باطنیہ نے اختیار کیا تھا۔ قرامطہ اور حسن بن صباح کے پیرو اسی نظریے کے علمبردار تھے۔ [4] ایضاً ص ۲۲۷

اسلامی قانونِ تعزیرات

حدودِ شرعیہ

از: ڈاکٹر عبدالعزیز عامر
(ترجمہ: معزرت شاہ شیرازی)

(۳)

باغیوں کے خلاف جنگ اور مشرکین اور مرتدوں کے خلاف جنگ میں متعدد حیثیتوں سے فرق ہے، جن میں سے اہم تر یہ ہیں:

۱۔ باغیوں کے خلاف کسی اقدام سے قبل ان کو متنبہ کرنا اور راہ راست پر آنے کا موقع دینا ضروری ہے۔ ان پر اچانک حملہ کر دینا جائز نہیں۔ اور ان سے لڑنے کا مقصد بھی صرف یہ ہوگا کہ وہ بغاوت سے باز آجائیں۔ ان کا قتل بجائے خود مقصود نہ ہوگا۔ لیکن مرتدوں اور مشرکین کے خلاف جنگ میں یہ پابندیاں ضروری نہیں ہیں۔

۲۔ ان کے ساتھ جنگ اس وقت تک کی جائے گی جب تک وہ لڑتے رہیں۔ اگر وہ بھاگ نکلیں تو بھاگنے ہوؤں کا پیچھا کرکے ان کو مارنا درست نہ ہوگا۔

۳۔ ان کے زخمیوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے گا جبکہ مشرکین اور مرتدوں کے زخمیوں پر حملہ کرنا جائز ہے۔ جنگ جمل کے دن حضرت علیؓ نے اپنے منادی کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا "کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے اور کسی زخمی پر حملہ نہ کیا جائے"۔

۴۔ جنگ میں جو باغی گرفتار ہو جائیں ان کو قتل نہ کیا جائے گا جبکہ مشرکین اور مرتدوں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ جو باغی قید میں ہوں ان کے بارے میں اگر یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ دوبارہ

جنگ میں شریک نہ ہوں گے تو انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ البتہ اگر اس کے برعکس صورت ہو تو انہیں قید میں رکھا جائے گا یہاں تک کہ باغیوں کے ساتھ جنگ ختم ہو جائے۔ اس کے بعد انہیں رہا کر دیا جائے گا اور جنگ ختم ہو جانے کے بعد بھی انہیں قید میں رکھنا مناسب نہ ہو گا۔[۱]

بھاگنے والے باغیوں کا پیچھا نہ کرنے اور ان کے زخمیوں پر حملہ نہ کرنے، اور ان کے قیدیوں کو قتل نہ کرنے کا مسلک اکثر فقہاء نے اختیار کیا ہے جن میں امام شافعیؒ اور احمد شامل ہیں۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ قدرے فرق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر باغیوں کا کوئی ایسا گروہ موجود نہ ہو جن سے یہ لوگ جا کر مل سکتے ہوں تو ان کا حکم یہی ہو گا۔ لیکن اگر ان کا کوئی ایسا جتھا ہو جس سے یہ لوگ جا کر مل سکتے ہوں تو اس صورت میں پیچھا کرنا، پکڑے جانے والوں کو مار دینا اور زخمیوں پر حملہ کرنا جائز ہو گا، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ لوگ اپنے جتھے سے جا ملیں گے اور اہل عدل مسلمانوں کے خلاف از سر نو جنگ برپا کر دیں گے۔ مزید براں امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر ان کا کوئی ایسا جتھہ نہ ہو تو انہیں خوب مارا پیٹا جائے اور قید کیا جائے یہاں تک کہ وہ بغاوت سے تائب ہو جائیں۔

پہلے فریق کا استدلال اُن روایات سے ہے جو حضرت علیؓ سے جنگِ جمل کے سلسلے میں منقول ہیں۔ اُن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ نیز وہ لوگ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا "ام عبد کے بیٹے! میری امت کے خلاف جو شخص بغاوت کرے اُس کا حکم کیا ہے"؟ حضرت عبداللہ نے عرض کیا "اللہ اور اللہ کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔" اس پر حضورؐ نے فرمایا "ان کے بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، ان کے زخمی پر حملہ نہ کیا جائے، ان کے قیدی کو قتل نہ کیا جائے، اور ان کا مال غنیمت کے طور پر تقسیم نہ کیا جائے۔" علاوہ بریں ان کا استدلال یہ ہے کہ باغیوں کے خلاف جنگ کرنے کی اصل غرض و غایت تو ان کو امام کے خلاف سرکشی سے روکنا ہے اور یہ مقصد ان کی ہزیمت سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کو قتل

---

[۱] الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۵۶ اور اس کے بعد۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ ص ۳۹

کرنا جائز نہ ہو گا جیسا کہ حملہ آور کا حکم ہے[۱]۔

میرے خیال میں جو فقہاء بھاگنے والوں کا پیچھا نہ کرنے اور ان کے مجروحین پر حملہ نہ کرنے کے قائل ہیں ان کی رائے زیادہ قابلِ قبول ہے۔ ایک تو ان دلائل کی بنا پر، جو اِس رائے کے قائلین پیش کرتے ہیں، اور دوسرے اس لیے کہ باغیوں کی شکست کے بعد انہیں قتل کرنا غیر ضروری سختی ہے اور شریعت اسلامیہ کی روح اس سے انکار کرتی ہے تاہم اگر شکست خوردہ باغیوں کے معاملہ میں مزید احتیاط کی ضرورت ہی ہو تو قتل کے سوا تعزیر کی دوسری صورتوں کے لیے دروازہ بہر حال کھلا ہوا ہے۔ اصل چیز تو مصلحت ہے اگر مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ باغیوں کو سزا دی جائے تو ایسا کرنا جائز ہے۔

۵۔ باغیوں اور مشرکین و مرتدین کے احکام میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ باغیوں کے اموال کو مالِ غنیمت نہ قرار دیا جائے گا اور نہ ان کی اولاد کو غلام بنایا جائے گا کیونکہ حدیث میں ہے "دارالاسلام ہر اس چیز کی حفاظت کرتا ہے جو اس کے اندر ہے اور دارالشرک ہر اُس چیز کو مباح کرتا ہے جو اس کے اندر ہے[۲]"۔

ایک اور فرق یہ ہے کہ باغیوں سے جنگ کرتے ہوئے ان پر گولہ باری نہیں کی جا سکتی، نہ ان کے گھر جلائے جا سکتے ہیں، اور نہ ان کے درخت کاٹے جا سکتے ہیں، کیونکہ جنگ دارالاسلام میں ہو رہی ہوتی ہے اور دارالاسلام اپنی تمام چیزوں کے ساتھ مامون ہے۔ ہاں اگر باغی اہلِ عدل کو گھیر لیں اور ان سے سخت ٹکراؤ کا خطرہ ہو تو اس صورت میں اہلِ عدل کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ جس طرح ہو سکے اپنا دفاع کریں۔ اس حالت میں ان کے لیے باغیوں کو قتل کرنا اور ان پر گولہ باری کرنا جائز ہو گا۔ کیونکہ ایک مسلمان کے لیے اپنی جان کی حفاظت کے لیے قتل کا ارتکاب کرنا جائز ہے جبکہ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہے[۳]۔

اوپر کی بحث سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ باغیوں کے معاملہ میں مختلف حالات کے لحاظ سے احکام مختلف ہیں۔ بعض حالات میں امام کے لیے یہ جائز ہے کہ ان کو قتل کے سوا دوسری سزائیں دے، مثلاً

---

[۱] معین الحکام ص ۱۸۵۔ الشرح الکبیر ج ا ص ۵۸ اور اس کے بعد۔

[۲] الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۵۷۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ ص ۳۹۔

[۳] الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ ص ۴۰

یہ کہ گرفتار کر کے انہیں قید کر دے۔ بعض دوسرے حالات میں قتل بھی جائز ہے جبکہ حالتِ جنگ رونما ہو جائے۔ یا بقولِ بعض ان کی طرف سے پھر جنگ برپا ہونے کا خطرہ ہو۔ کچھ دوسرے حالات میں ان سے نمٹنے کی ایک ہی صورت ہے قتل، اور وہ اس وقت جبکہ اُس کے سوا ان کی شورش کو کسی اور طریقہ سے دفع نہ کیا جا سکتا ہو اور مسئلہ خود اپنی جانوں کی حفاظت کا پیدا ہو جائے۔

مسئلۂ بغاوت کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے میں جو کچھ سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ جن حالات میں باغیوں کے قتل کی اجازت دی گئی ہے ان میں سے اکثر صورتیں وہ ہیں جو حالتِ جنگ سے متعلق ہیں اور ظاہر ہے کہ جب جنگ جاری ہو تو قتل کے لیے الگ حکم صادر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی صورت اُن حالات کی بھی ہے جن میں باغیوں کے مقابلہ میں دفاع کی خاطر ان کے قتل کی اجازت دی گئی ہے، کیونکہ یہ ان کے اپنے ہی طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ ہے۔ لہٰذا اِن احکام سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ باغیوں کے لیے شریعت کی جانب سے ایک حد مقرر ہے اور وہ ہے سزائے موت۔ دراصل ان کی موت شریعت کو مطلوب نہیں ہے جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے بلکہ وہ بعض ناگزیر حالات میں واقع ہوتی ہے۔ پس یہ کہنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مختلف حالات میں باغیوں کے لیے جو احکام دیئے گئے ہیں وہ سب تعزیر کی نوعیت رکھتے ہیں جس میں کبھی قتل تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اسی بنا پر میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ جرمِ بغاوت اُن جرائم میں سے نہیں ہے جن کے لیے شارع نے ایک خاص سزا (حد) مقرر کر دی ہے۔

شاید یہ بغاوت کے جُرم کی خاص نوعیت ہی کا تقاضا ہے کہ اس کے احکام ایک طرف مشرکین و مرتدین کے احکام سے مختلف ہیں اور دوسری طرف ڈاکوؤں اور رہزنوں کے احکام سے بھی مختلف ہیں باغیوں کی اصل غرض و غایت یہ نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں کا مال لوٹیں، اور خواہ مخواہ لوگوں کو قتل کریں، اور ملک کے اندر فساد پھیلائیں۔ اسی طرح ان کی جدوجہد دینِ اسلام کے خلاف بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہ مسلمان ہوتے ہیں اور ان کے مسلمان ہونے میں کسی کو شک نہیں ہوتا۔ دراصل وہ امام یعنی حاکمِ وقت اور حکومتِ وقت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اُس کے اقتدار کو چیلنج کرتے ہیں اور نظامِ حکومت کو بزور بدلنا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ کارروائی محض فساد فی الارض کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ ان کے پاس کچھ اصول اور دلائل ہوتے ہیں

جن کی بنا پر وہ امام وقت، یا وقت کے نظامِ حکومت کے خلاف یہ معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اپنے نزدیک وہ نیک نیتی سے اسلام کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کا مقصد عام مجرموں کے جرائم سے بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے اور ان کے نفوس جرائم پیشہ نفوس نہیں ہوتے۔ اگرچہ شریعت اسلامیہ نے ان سے جنگ کرنے کی اجازت دی ہے جس کے نتیجے میں ان کا قتل ہو جانا بھی ممکن ہے۔ لیکن یہ تشدد اس لیے روا رکھا گیا ہے کہ اس سے فتنوں اور اضطرابات کو ختم کیا جا سکے اور مسلمانوں کے قانونی سربراہوں کو وہ ضروری استحکام حاصل ہو جو ہر نظام کے لیے ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ بار آور ہو سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی شریعت نے اس غرض کی رعایت بھی ملحوظ رکھی ہے جس کی خاطر یہ جرم کیا جاتا ہے۔ باغیوں کے پیش نظر رئیس مملکت کو معزول کرنا یا وقت کی انتظامیہ کو معزول کرنا ہوتا ہے یا امام وقت کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں۔ یہ تمام امور ملکی سیاست اور سیاسی نظام سے متعلق ہیں۔ باغیوں کے پاس اپنے اس خروج کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ جواز ہوتی ہے اور کچھ دلائل ہوتے ہیں جنہیں وہ لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ جن وجوہ و دلائل پر وہ اعتماد کرتے ہیں وہ ضعیف ہوتے ہیں، لیکن شریعت اُن کی اس مخصوص حیثیت کا لحاظ کر کے احکام میں اُن کے اور دوسرے مجرموں کے درمیان فرق کرتی ہے جن کے جرائم کے محرکات اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اوپر ہم نے مختصراً یہ بتا دیا ہے کہ ان کے احکام میں بعض نمایاں فرق کیا ہیں مگر اصولاً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ باغیوں کو دوسرے مجرموں سے جو بنیادی فرق جدا کرتا ہے وہ ان کا سیاسی مجرم ہونا ہے نہ کہ اخلاقی مجرم ہونا۔ لہٰذا ان کی سزا میں بھی صرف اس بات کو سامنے رکھا جائے گا کہ وہ اطاعتِ امام کی طرف پلٹ آئیں۔ یہ مقصد حاصل ہو جائے تو اس کے بعد ان پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ اسی طرح جنگ کی حالت میں جو جرائم وہ کریں ان کا حکم بھی عام جرائم جیسا نہ ہو گا۔ پھر چونکہ ان کی جنگ کسی شرعی تاویل پر مبنی ہوتی ہے اس لیے ان کا معاملہ مرتدوں اور حربی کافروں سے بھی مختلف ہوتا ہے جنہیں قتل کرنا اعلاء کلمۃ اللہ اور حفاظت دین کی خاطر مطلوب ہوتا ہے۔

باغیوں اور ڈاکوؤں کے درمیان اس لحاظ سے بھی واضح فرق ہے کہ ڈاکوؤں کے پیش نظر لوٹ مار، فساد انگیزی اور لوگوں کی جان و مال پر دست درازی ہوتی ہے۔ یہ ایک ذلیل حرکت ہے جو ایک مجرم

رسائل و مسائل

مسائلِ عشر پر مزید بحث

سوال: ترجمان القرآن جلد ۶۶ - جنوری ۱۹۶۰ء میں "عشر کے چند مسائل" کے زیرِ عنوان سوالات کے جواب سے مکمل رہنمائی نہیں ہوئی - جواب میں ایک جگہ درج ہے: "ہند و پاکستان کی زمینوں کے عشری یا خراجی ہونے کے مسئلے پر اگرچہ بحث ہوتی رہتی ہے لیکن اس دیار کے مستند علماء کا جن میں حنفی اور اہلحدیث سب شامل ہیں، فتویٰ یہی ہے کہ مسلمانوں کی اراضی پر عشر ادا کرنا زیادہ صحیح اور محتاط مسلک ہے۔"

یہ بات بہت مجمل اور مبہم ہے۔ کسی متعین عالمِ دین کا متعین فتویٰ نقل نہیں کیا گیا۔ مملکتِ پاکستان بن جانے کے بعد ہند و پاکستان کی زمینوں کو ایک سطح پر لا کر بحث کرنا صحیح نہیں ہوگا

(بقیہ: اسلامی قانون تعزیرات)

نفس ہی سے صادر ہو سکتی ہے اور ایسا مجرم سخت عذاب کا مستحق ہوتا ہے تاکہ جان و مال اور امن و امان اور معاشرے کے نظم کی حفاظت کی جا سکے۔ اسی بنا پر ان کے لیے قتل، سُولی، قطع اعضاء اور جلاوطنی جیسی سخت سزائیں ہی معقول ہو سکتی ہیں جو ان کے جُرم کی نوعیت کے مناسبِ حال ہیں اور ایسی ہی سزائیں لوگوں کو آئندہ ارتکابِ جُرم سے روک سکتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں، باغیوں کے اغراض و مقاصد اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی نوعیت سیاسی ہوتی ہے، اور اپنے عقیدے کے مطابق وہ اصلاح کرنا چاہتے ہیں اور انہیں دین اور حکومت کی سربلندی مطلوب ہوتی ہے۔ لہٰذا اغراض و مقاصد کے اختلاف کی وجہ سے احکام میں بھی اختلاف ہونا لازم ہے۔

کیونکہ دونوں ممالک میں زمینوں کی ملکیت اور قبضے کی کیفیت بالکل بدل چکی ہے، لہٰذا تبدیلیِ حالات کے نظریہ کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

دوم، علما میں اختلاف کی بنا پر ہی آپ سے رجوع کیا گیا ہے، تاکہ تسلی بخش اور ٹھوس جواب مل سکے۔

چند ایک مقامات پر مسئلہ کے بیان میں قدرے تضاد بھی پایا جاتا ہے جسے دُور کرنا نہایت ضروری ہے۔ ایک مقام پر کہا گیا ہے کہ "ہر مسلمان حکمران جو بھی زرعی محصول وصول کرے اسے شرعاً عُشر یا خراج کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ عشر یا خراج کی تعریف میں صرف وہی ٹیکس آ سکتا ہے جو اسلامی نظامِ حکومت کے زیرِ اہتمام اسی نیت کے ساتھ اور انہی قواعد و مقاصد کے تحت لیا اور دیا جائے جو شریعت میں عشر و خراج کے لیے مقرر ہیں۔ زمین پر جو رائج الوقت مالیہ عاید کیا جاتا ہے، اس میں عشر یا خراج کا کوئی بعید ترین تصور بھی کارفرما نہیں ہے"۔ اسی بحث میں دوسری جگہ طریقِ وصولی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: "ہاں، عشر ادا کرنے سے پہلے پیداوار میں سے مالیہ وضع ہو سکتا ہے"۔ ساتھ ہی فقہائے حنفیہ کا مسلک بتلاتے ہوئے اخراجاتِ کاشت کو عشر نکالتے وقت پیداوار سے کم نہ کرنے پر بھی عمل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اگر عشر نکالنے سے پہلے پیداوار میں سے مالیہ وضع ہو سکتا ہے، تو کاشت کے اخراجات کیوں وضع نہیں ہو سکتے؟

ایک جگہ احتیاط اور اتقا کا تقاضا بیان کرتے ہوئے مسلمان صاحبِ پیداوار پر ہر حال میں عشر کی پابندی لازم قرار دی ہے۔

التماس ہے کہ اس مسئلہ پر غور فرما کر صحیح رہنمائی فرمائیں۔

جواب: آپ نے ترجمان میں شائع شدہ جواب پر جو معارضات وارد کیے ہیں ان پر مزید گزارشات درج ذیل ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہند و پاکستان کی زمینوں کو ایک سطح پر لا کر بحث کرنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ دونوں ممالک کی ملکیت کی کیفیت بدل چکی ہے۔ آپ نے یہ واضح نہیں کیا کہ

تقسیم کے بعد بھی جو زمینیں مسلمانوں کی ملک قرار پائی ہیں، ان میں وہ کونسی تبدیلی واقع ہوئی ہے جو اطلاقِ عشر میں تغیر کا باعث ہو سکتی ہے۔ میں نے تو ہندو پاکستان کا لفظ محض اس لیے استعمال کیا ہے کہ تقسیم سے قبل بہر حال یہ ایک ملک تھا۔ اس میں بسنے والے مسلمانوں کے مسائل بیشتر مشترک تھے اور ان میں رہنمائی کے لیے وہ بالعموم ایسے علماء سے رجوع کرتے تھے جن کی آرا پر پورے برصغیر میں اعتماد کیا جاتا تھا۔ اس طرح کی آرا سے استفادہ تقسیم کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے۔ الّا یہ کہ وہ کسی ایسے مسئلے سے متعلق ہوں جس کی نوعیت اب بنیادی طور پر بدل چکی ہو۔ پاکستان کے قیام کے بعد جو زمینیں مسلمانوں کی ملک میں ہیں، میرے نزدیک ان پر عشر کا وجوب پہلے سے بھی زیادہ شک و شبہ سے بالاتر ہو گیا ہے، کیونکہ کسی خطۂ زمین میں ایک آزاد مسلم مملکت کے وجود میں آنے کے وقت جو اراضی مسلمانوں کی مملوکہ ہوں ان پر عشر لامحالہ واجب ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کی زرعی زمینوں پر عشر کے معاملے میں جس بحث و اختلاف کا ذکر میں نے کیا ہے، اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا اور نہ اس سے میرا یہ مدعا تھا کہ جو شخص چاہے عشر دے دے اور جو شخص چاہے اختلاف کا سہارا لے کر عشر کی ادائیگی سے انکار کر دے۔ تھوڑا بہت اختلاف تو ہر مسئلے میں ہو سکتا ہے لیکن آخری رائے قائم کرتے وقت بہر حال دیکھا یہی جاتا ہے کہ مستند علماء کی اکثریت کا مسلک کیا ہے اور دلائل کس جانب زیادہ قوی اور راجح ہیں۔ ان امور کی وضاحت سے میرا سابق جواب خالی نہیں ہے، اگرچہ بحث میں اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ تاہم آپ نے چونکہ ادلہ کی تفصیل طلب کی ہے اس لیے میں چند علماء کی آرا پیش کرتا ہوں:

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی ایک کتاب "اسلام کا نظامِ اراضی" حال ہی میں تین سال قبل شائع ہوئی ہے۔ اس میں صفحہ ۱۶۳ پر وہ لکھتے ہیں:

"غیر مسلموں کی متروکہ زمینیں جو حکومتِ پاکستان نے مسلم مہاجرین میں تقسیم کیں، یہ سب زمینیں عشری ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے خواہ ان کی کچھ بھی حیثیت ہو، کیونکہ بناتے پاکستان اور دونوں حکومتوں کے معاہدۂ تبادلۂ جائداد کے بعد یہ سب اراضی بیت المال کے حکم میں داخل ہو کر حکومت کی تقسیم کے ذریعے مسلمانوں کی ملکِ ابتدائی بن گئیں اور مسلمانوں کی زمینوں پر عشر ہی لگانا چاہیے۔ اس لیے یہ سب عشری ہیں۔ اسی طرح وہ زمینیں جو پاکستان قائم ہونے سے پہلے غیر آباد تھیں، کسی شخص کی ملکیت میں

داخل نہیں تھیں۔ بعد میں حکومت نے ان میں پانی پہنچانے کے ذرائع مہیا کیے، ان کو آباد کیا اور مسلمانوں کو بقیمت یا بلاقیمت تقسیم کیا۔ یہ سب زمینیں بھی چونکہ ابتدائی ملکیت مسلمانوں کی ہوگی اس لیے عُشری قرار دی جائیں گی۔"

پھر آگے صفحہ ۱۶۹ پر لکھتے ہیں:

"جس خطے میں جو زمینیں مسلمان زمینداروں کے مالکانہ قبضہ میں نسلاً بعد نسلٍ چلی آتی ہیں ان کی ملکیت کو صرف اس بنیاد پر مشتبہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس علاقہ کی ابتدائے فتح کے وقت غیر مسلم مالکان کا قبضہ مالکانہ بدستور قائم رکھا گیا تھا۔"

صفحہ ۱۷۰ پر مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مفتی اوّل دیوبند کے دو فتوے نقل کیے گئے ہیں۔ پہلا یہ ہے:

"ہندوستان میں جو اراضی مملوکۂ مسلمین ہیں وہ عشری ہیں کیونکہ اصل وظیفہ مسلمانوں کی زمین کا عشر ہے پس بحالتِ اشتباہ اَحوط عشر نکالنا ہے"

دوسرا فتویٰ یُوں ہے:۔

"ہندوستان کی تمام زمینوں کا ایک حکم نہیں ہے۔ البتہ جو زمین مملوکۂ مسلمین ہے اس میں عشر واجب ہے، مسلمانوں کو عشر نکالنا چاہیے۔"

اس کے بعد صفحہ ۱۸۲ پر مفتی محمد شفیع صاحب نے عنوان قائم کیا ہے" سرکاری مالگزاری ادا کرنے سے عشر ادا نہیں ہوگا" اس کے تحت لکھتے ہیں:

"اگر حکومت مسلم لوگوں سے زکوٰۃ اور عشر و خراج اسی نام سے اسی کے اصول شرعیہ کے موافق وصول کرے اور انہی کے مصارف پر خرچ کرنے کی پابندی کا اعلان کرے تو یہ زکوٰۃ یا عشر جو حکومت مسلمہ کو دیا جائے گا۔ وہ شرعاً زکوٰۃ اور عشر ہی میں شمار ہوگا۔ . . . لیکن حکومتِ پاکستان اس وقت تک مسلمانوں سے جو ٹیکس وصول کرتی ہے، نہ وہ زکوٰۃ کے اصول پر وصول کیا جاتا ہے، نہ زکوٰۃ کے نام سے لیا جاتا ہے، نہ زکوٰۃ کے مصارف میں صرف کرنے کی حکومت پابندی قبول کرتی ہے۔ اسی طرح زمینوں کی جو سرکاری

مالگزاری وصول کرتی ہے حکومت اس کو بھی عشر اور خراج کے شرعی اصول کے ماتحت وصول نہیں کرتی، نہ عشر و خراج کہہ کر وصول کرتی ہے، نہ اس کے مصارف میں صرف کرنے کی پابندی کا کوئی اعلان حکومت کی طرف سے ہے۔ اس لیے حکومت مسلمہ کے انکم ٹیکس یا زمین کی سرکاری مالگزاری ادا کر دینے پر بھی زکوٰۃ اور عشر کے فرائض سے سبکدوشی نہیں ہوتی۔"

اس کے بعد مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا بھی ایک فتویٰ درج ہے۔ ان کے سامنے بعض علماء کی آرا پیش کی گئی تھیں کہ سرکاری مالگزاری ادا کرنے سے عشر ادا ہو جاتا ہے اور دریافت کیا گیا تھا کہ قولِ مضبوط آپ کے نزدیک کونسا ہے۔ مولانا تھانویؒ نے جواب میں فرمایا تھا: "ہم کو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ادا نہیں ہوتا جیسے انکم ٹیکس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ باقی ان حضرات کے ارشاد کا مبنیٰ معلوم نہیں"۔ یہی رائے آگے مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی بھی نقل کی گئی ہے۔

مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی، علم الفقہ، جلد چہارم ص۳۴ پر فرماتے ہیں: "سرکاری مالگزاری جو دی جاتی ہے، یہ عشر میں محسوب نہیں ہو سکتی، کیونکہ عشر کے مصارف میں صرف نہیں کی جاتی۔ پس اس کے دینے سے عشر ساقط نہ ہوگا۔"

مولانا محمد امجد علی صاحب قادری، جو مولانا احمد رضا خاں صاحب کے شاگرد رشید ہیں، وہ اپنی کتاب "بہارِ شریعت" حصہ پنجم صفحہ ۴۸ پر فرماتے ہیں:

"زمین تین قسم ہے (۱) عشری (۲) خراجی (۳) نہ عشری نہ خراجی۔ اول اور سوم دونوں کا حکم ایک ہے، یعنی عشر دینا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی زمینیں خراجی نہ سمجھی جائیں گی۔ جب تک کسی خاص زمین کی نسبت خراجی ہونا دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو۔"

پھر صفحہ ۵۲ پر فرماتے ہیں:

"گورنمنٹ کو جو مالگزاری دی جاتی ہے، اس سے خراج شرعی ادا نہیں ہوتا بلکہ وہ مالک کے ذمے ہے، اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔"

اب میں آخر میں مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب دہلوی کے فتاویٰ نذیریہ جلد اول صفحہ ۴۹۴ کی ایک

عبارت نقل کروں گا۔ مولانا موصوف اہلحدیث حضرات کے ہاں شیخ الکل شمار کیے جاتے ہیں۔ عبارت درج ذیل ہے:

"اور واضح ہو کہ ہر زمین کی پیداوار میں عشر یا نصف عشر جیسی صورت ہو، لازم ہے بشرطیکہ مالک پیداوار مسلمان ہو اور پیداوار نصاب کو پہنچی ہو، خواہ زمین خراجی ہو یا عشری اور خواہ زمین مالک پیداوار کی مملوک ہو یا نہ ہو، ہر حالت میں عشر یا نصف عشر لازم ہے، اس واسطے کہ ادلہ وجوب عشر و نصف عشر عام ہیں ..." (کتبہ محمد عبدالرحمٰن المبارکپوری عفا اللہ عنہ)

آپ نے میرے تضادات کی طرف جو اشارہ کیا ہے، اسے میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔ مالیہ کے متعلق میں نے یہی کہا ہے کہ وہ عشر یا خراج کا قائم مقام نہیں ہے، اس لیے کوئی شخص مالیہ ادا کر کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے مالیے کی صورت میں عشر یا خراج ادا کر دیا۔ اور فقہائے حنفیہ کا مسلک میں نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ عشر نکالنے سے پہلے اخراجات کاشت کو پیداوار میں سے وضع کرنا صحیح نہیں سمجھتے ——— ——— البتہ مالیہ کا معاملہ عام اخراجات کاشت سے اس وجہ سے مختلف ہے کہ یہ اُس دور میں موجود نہ تھا جب کہ فقہائے حنفیہ نے اخراجات وضع نہ کرنے کا فتویٰ دیا تھا۔ مزید برآں ایک لحاظ سے مالیہ اخراجات کاشت کے بجائے ایک زرعی ٹیکس ہے۔ کیونکہ اخراجات کاشت سے مراد وہ اخراجات ہیں جن کا مقصد اصلاح زمین اور حصولِ پیداوار ہوتا ہے۔ اس لیے عشر کا حساب کرنے سے پہلے پیداوار کی مالیت میں سے اگر کوئی شخص مالیہ وضع کرے اور بعد میں عشر نکالے تو مضائقہ نہیں۔ یہ تنہا میری رائے نہیں، بلکہ بعض علماء نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔ تاہم اگر آپ چاہیں تو اسے رد کر دیں اور اچھا ہے کہ پوری پیداوار پر مالیہ منہا کیے بغیر عشر دیں۔ اس میں غریبوں کا زیادہ فائدہ ہے اور احکام شریعت میں جتنی زیادہ احتیاط برتی جائے پسندیدہ ہے۔

(بقیہ اشارات)

اسلام میں صرف تعمیرات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جو رقم پیدا آوری کاموں میں صرف ہوتی ہے اس کا تناسب سر بفلک عمارات، پارک، اور اسی نوعیت کے دوسرے نمائشی کاموں کے صرف سے کہیں کم ہے۔

جس معاشرے میں عیش عشرت کی گرم بازاری ہو وہاں اخلاقی احساسات مٹتے ہیں اور اخلاق کی بندھنیں جلد ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس معاشرے کی صلاحیتیں کسی تعمیری کام میں صرف ہونے کے بجائے عیش پرستوں کے لیے عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنے میں صرف ہونے لگتی ہیں۔ زندہ قومیں قومی دولت سے اخلاق کی تعمیر کرتی ہیں، معاشرے کے کمزور طبقوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے مختلف منصوبے بناتی اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کی ایک ایک پائی پورے معاشرے کے اجتماعی مفاد کو سامنے رکھ کر خرچ کی جاتی ہے۔ لیکن بے مقصد قوموں کے ہاتھ میں جب دولت آتی ہے تو اس سے اخلاق برباد ہوتے ہیں، عوام کے ضمیر بکتے اور ان کی عزتِ نفس کے سودے ہوتے ہیں اور اس دولت کا اکثر و بیشتر حصہ عوامی فلاح کے بجائے حکمران طبقوں اور ان کے وابستگان کے لیے عیش و آرام مہیا کرنے، ان کے کارناموں کو اچھالنے اور ان سے اختلاف کرنے والوں کو دبانے میں صرف ہوتا ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

کی

دو بلند پایہ تصنیفات

مسئلہ جبر و قدر

- کیا انسان مجبور محض ہے یا کلی طور پر خود مختار ہے؟
- مسئلہ جبر و قدر کی حقیقت
- اس مسئلہ میں فلاسفہ، سائنس دانوں اور معلمین اخلاق کی ناکامی
- جبر و قدر کے بارے میں صحیح اسلامی مسلک
- متکلمین کی موشگافیاں اور ان کی ناکامیاں
- قرآن مجید کا اصل منشاء و مقصد
- عقیدہ تقدیر کی افادیت اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات
- ہدایت و ضلالت کا خدائی قانون
- جزا و سزا کا الٰہی ضابطہ
- دل و دماغ کی الجھنوں کا اطمینان بخش حل

مولانا مودودی کا

پر زور استدلال، دلنشین طرز بیان

[illegible] • قیمت ۰۰ روپیہ

مرتد کی سزا

(اسلامی قانون میں)

- کیا ایک اسلامی ریاست میں تبلیغ کفر کی اجازت دی جا سکتی ہے؟
- کیا ایک مسلمان تبدیلی مذہب کا حق رکھتا ہے؟
- اسلامی قانون میں جرم ارتداد کی سزا کیا ہے؟
- مخالفین کے اعتراضات اور ان کے مسکت و مدلل جوابات
- مغربی ممالک میں مرتدین کے ساتھ سلوک؟
- اسلام کے ایک اہم قانون کی تشریح ٹھوس دلائل کے ساتھ
- حق گوئی و بے باکی کا شاہکار
- دینی حمیت و غیرت کا جرأت مندانہ اظہار
- ہر مسلمان کے پڑھنے کیلئے ایک ضروری کتاب

[illegible]

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ،
شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

رجسٹرڈ ایل ۵۳۴۰ نمبر